اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝

حالات

اعلحضرت خواجہ غلام مرتضیٰ بیربلوی رحمۃ اللہ علیہ

تصنیفِ لطیف

قطبؒ العالم محبوبؒ الٰہی حضرت صاحبزادہ محمد عمرؒ صاحبؒ رحمۃ اللہ علیہ

ترتیب و تدوین

غلام عابد خان، ایم۔ اے (تعلیم و تاریخ)

باہتمام

قاضی محمد رضا مہتمم دار العلوم عطائیہ نلی ضلع خوشاب

الا ان اولیاء اللہ لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون

حالات

اعلحضرت خواجہ غلام مرتضیٰ بیربلوی رحمۃ اللہ علیہ

تصنیف لطیف

قطب العالم محبوب الٰہی حضرت صاحبزادہ محمد عمر صاحب رحمۃ اللہ علیہ

ترتیب و تدوین

غلام عابد خان ایم ۔ اے (تعلیم و تاریخ)

باہتمام

ی محمد رضا مہتمم دارالعلوم عطائیہ تلّی ضلع خوشاب

اشاعت .... اوّل
سنِ اشاعت .... سنہ ۱۹۸۷ء
تعداد .... ایک ہزار
کتابت .... محمد ابراہیم بلال
ناشر .... قاضی محمد رضا
مطبع .... داتا دالا پرنٹرز، ۱۸ بابا فرید روڈ لاہور
قیمت .... ۷ روپے

کتاب ملنے کے پتے

ادارۂ تصوف احمد پارک موہنی روڈ لاہور

خانقاہ عالیہ نقشبندیہ بیربل شریف ضلع سرگودھا

Marfat.com

فہرستِ مضامین

از: قطب العالم حضرت صاحبزادہ محمد عمر رحمۃ اللہ علیہ

مقصدِ تحریر

حضرت اعلیٰ مولانا غلام مرتضیٰ رحمۃ اللہ علیہ کے حالات لکھنا اصالتاً مقصود نہیں بلکہ دین اور طریقت کے اہم نکات کو مثالاً واضح اور روشن کرنا مقصود بالذات ہے۔ لہٰذا تمثیلاً آپ کی درخشاں حیاتِ طیبہ کے بعض حالات قلم بند کیے گئے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے حضرت رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بابت کسی نے دریافت کیا تو فرمایا:

انہ لخلق العظیم انہٗ کتابٌ مبین

اکابر سے کسی کی سوانح لکھنے کا مقصد اس کی سیرت لکھنا خاص مقصود نہیں ہوتا، بلکہ ہدایت اور رُشد کیلئے اس کی مثال پیش کرنا اور قوم و ملت کو خیر و اصلاح کی دعوت دینا ہوتا ہے۔ اس لئے میری تحریر کو اگر آپ اس مقصد کیلئے پڑھیں گے، تو انشاء اللہ اس کے وہ نتائج واضح پائیں گے، جن کیلئے یہ اوراق لکھے گئے۔ اور جن سے مقصود صرف خدمتِ دین ہے۔ اور بس۔

اللہ تعالیٰ ان روشن اوراق کو میرے دل کی روشنی کا باعث بنائے۔ اور حسنِ انجام سے سرفراز فرمائے۔ آمین!

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

مقدّمہ

از

غلام عابد خان لیکچرار، واپڈا ڈگری کالج
(تربیلہ ڈیم)

قدیم عہد میں یہودیوں کے ہاں قدماء کی سرگذشتیں لکھی جاتی تھیں۔ اِس کے بعد رومیوں اور یونانیوں نے اِس طرف توجّہ کی۔ یونان کے مشہور سوانح نویس پلوٹارک کی سوانح دوسری صدی عیسوی کی پیداوار ہے، جو قدیم ترین سوانح تصوّر کی جاتی ہے ... زمانہ متوسّط میں مسلمانوں کی سوانح نگاری سب سے زیادہ وقعت پذیر ہوئی، لیکن اس کا زیادہ تر انحصار روایت پر ہوتا تھا۔ اور روایت اتنی قابلِ اعتناء نہ تھی۔ صرف رجالِ حدیث میں خصوصی احتیاط برتی گئی۔ سوانحی تذکروں کو تو محض روایت کی بنا پر لکھا جاتا تھا۔ سترھویں صدی عیسوی میں یورپ میں سوانح نگاری کو انتہائی طور پر ترقّی ہوئی۔ اور تاریخ کی طرح سوانح نگاری نے بھی فلسفہ کی شکل اختیار کرلی، اور سوانحی واقعات سے منطقی طور پر استخراج کیا جانے لگا جس کے نتیجے میں سوانح نگاری ایک منفرد علمی و ادبی اسلوب بن گئی۔

ہمارے دینی ادب میں سوانح نگاری کو ایک خاص مقام حاصل رہا ہے۔ اور ترتیبِ سوانح حیات کا طریقہ قدیم سے چلا آرہا ہے۔ جس طرح تاریخ کے واقعات اور اس کے مختلف کردار آنے والی معاشرتی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں بعینہٖ سلف صالحین کی سیرت اور حالاتِ زندگی آنے والی نسلوں پر یقیناً اثر انداز ہوتے ہیں۔ اور ان کے نقوشِ قدم اپنے متوسّلین کے لئے بالخصوص مشعلِ ہدایت کا کام دیتے ہیں۔ قرآنِ مجید کی تاریخیت یعنی سابقہ قوموں کے حالات اور واقعات کا بڑا مقصد بھی انسانیت کے لئے رشد و ہدایت کا سامان بہم پہنچانا ہے۔ احادیثِ نبوی صلّی اللّٰہ علیہ وآلہٖ وسلّم، جو حیاتِ طیّبہ کا پرتو ہیں، اور کتبِ سیر میں نبی اکرم صلّی اللّٰہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے اقوال، معمولات، واقعات اور معجزات

موجود ہیں، قیامت تک بنی نوعِ انسان کی ہدایت کے لئے مینارِ نور ہیں۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے واقعاتِ زندگی سے تاریخ کی کتابوں کے اوراق مزین ہیں۔ اسی طرح بزرگانِ دین اور اولیائے کرام کے تذکرے، جو ان کے حالات، واقعات اور معمولاتِ زندگی پر مشتمل ہوتے ہیں، اِن سب کا مقصد یہ ہے کہ طالبانِ حق ان کے مطالعے سے حق کی روشنی حاصل کریں۔ اور اپنی دینی و دنیوی زندگی کو سنواریں۔ انسانی فطرت کا خاصا ہے، کہ وہ اپنے مشاہدے اور قریبی ماحول سے زیادہ اثر پذیر ہوتی ہے۔ اِس لئے راہِ سلوک میں مراقبے، مشاہدے اور صحبتِ شیخ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ لیکن جن لوگوں کو یہ سعادت نصیب نہ ہو، ان کے لئے سلف صالحین کے حالاتِ زندگی کا مطالعہ مشعلِ راہ بن سکتا ہے۔

اِس مقصد کے پیشِ نظر بعض عقیدت مندوں نے اولیائے کرام کی سوانح حیات قلم بند کی ہیں۔ کیونکہ بقول سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی قدس سرہٗ مردانِ خدا کی باتیں اللہ تعالےٰ کے لشکروں میں سے ایک لشکر ہیں۔ اگر مرید کا دِل شکستہ ہو تو ان کے ذکر سے قوی ہو جاتا ہے۔ اور وہ اِس لشکر سے مدد حاصل کرتا ہے۔ جس طرح ایک لشکر اپنی اقلیم کو غنیم سے پاک اور امن وامان میں رکھتا ہے؛ اسی طرح اولیاء اللہ کا تذکرہ کشورِ دل سے وساوس شکوک، حرص و آزار اور شرک و نفاق جیسے دشمنوں کی بیخ کنی کرتا ہے۔ اور دوسری طرف امن و سکون، یقین و طمانیت، صبر و قناعت، تسلیم و رضا اور ایمان و عرفان سے معمور کرتا ہے۔ حضور نبی کریم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کا ارشادِ گرامی ہے:

تنزل الرحمۃ عند ذکر الصالحین۔ (صالحین کا ذکر کرتے وقت اللہ تعالیٰ کی رحمت نازل ہوتی ہے)

نیز ارشاد فرمایا:

ذکر اولیاء حکمۃ للقلوب وکفارۃ الذنوب۔ (اولیائے کرام کے ذکر سے قلوب حکمت سے بھر جاتے ہیں اور گناہوں کا کفّارہ نصیب ہوتا ہے)

نیک لوگوں کی صحبت رکھنے سے اللہ تعالیٰ بندے کو نیک بنا دیتا ہے۔ فتح موصلیؒ فرماتے ہیں کہ جو شخص اپنے دل کو عِلم و حکمت اور مشائخین کے سخن سے باز رکھتا ہے،

Marfat.com

اُس کا دل مردہ ہوجاتا ہے۔ حضرت حاتم عاصمؒ کا قول ہے، کہ جو شخص رات دن میں ایک منزل قرآن شریف اور حکایاتِ شیخ اپنے اوپر پڑھنا لازم ٹھہرائے، وہ اپنے ذہن کو سلامتی کے ساتھ نگاہ میں رکھ سکتا ہے۔ پس مبارک ہیں وہ لمحے جو اِن تذکروں میں بسر ہوں اور مقدس ہیں وہ صحبتیں جو اِس مقصد کے لئے گرم رہیں۔

زیرِ نظر کتاب قطب العالم، جُنیدِ وقت، مولیٰنا و مرشدنا حضرت خواجہ غلام مرتضیٰ بیربلوی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات پر مشتمل ایک مختصر تذکرہ ہے، جسے آپؒ کے پوتے، مرشدی و مولائی حضرت قبلہ صاحبزادہ محمد عمر رحمۃ اللہ علیہ نے تحریر فرمایا تھا۔ اِس مقدس خانوادے کے فرد کی حیثیت سے آپ نے جو کچھ لکھا، اُس کا انحصار ذاتی مشاہدے پر ہے۔ جب حضرت خواجہ غلام مرتضیٰ رحمۃ اللہ علیہ کا ۱۳۲۱ھ میں وصال ہوا، تو اس وقت حضور قبلہ عالمؒ کی عمر ساڑھے سولہ سال کے قریب تھی، جس کا ذکر آپ نے تذکرے کے اوائل میں کر دیا ہے۔ اِس عمر میں ایک فرد اپنی خاندانی روایات اور معاملات سے بخوبی واقف ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اپنے جدِ امجد کے حالاتِ زندگی قلم بند کرنے کے لئے مصنف کو کسی روایت کا سہارا لینا نہیں پڑا۔ یہ تذکرہ کس انداز میں تحریر کیا گیا، یہ ایک الگ موضوع ہے، جس کا ذکر میں اگلی سطور میں بالتفصیل کروں گا۔ فی الحال خانوادہ بیربلوی کا مختصر ذکر کرنا بے محل نہ ہوگا۔

صاحبِ تذکرہ قطب العالم اعلیٰ حضرت خواجہ غلام مرتضیٰ قدس سرّہٗ کا تعلق اعوان خاندان سے ہے۔ جس میں فضیلت اور شرافت نسل در نسل ودیعت چلی آ رہی ہے لفظ اعوان جو عون سے مشتق ہے، اِس کے معنی مدد کے ہیں۔ چونکہ یہ لوگ عرب ممالک سے اِس ملک میں شاہِ اسلام کی ملک گیری میں مدد کرنے کے واسطے آئے تھے، اِس لئے "اعوان" ان کا عرفِ عام قائم ہوگیا۔ اصل میں قریشی، ہاشمی، علوی ہیں۔ یہ قوم زیادہ تر کوہستان نمک کی سرسبز و شاداب وادئ سون، علاقہ تھاڑ، ونہار اور پوٹھوار میں بکثرت آباد ہیں۔ یہ لوگ نہایت وجیہہ، جری اور دیندار ہیں۔ اِن علاقوں میں اس خاندان کے کئی بزرگوں کے مزارات اور خانقاہیں اَب بھی مرجعِ خلائق ہیں۔ بالخصوص حضرت کعب زبیرؒ جن کا مسکن خطہ خوشاب تھا۔ اور اس سے ملحق بہت سے علاقوں کے حکمران تھے۔ بہت بڑے صاحب

کرامت بزرگ گزرے ہیں، جن کا مزار خوشاب کے جنوب مشرق میں موضع کنڈان میں ہے
اسی خاندان کے ایک بزرگ حضرت سلطان باہوؒ طریقہ قادریہ کے بڑے کامل ولی اللہ
جن کا مزار شریف ضلع جھنگ میں واقع ہے۔ جن کا فیض بہت دُور دُور تک پھیلا
ہے۔ دُور دراز سے لوگ مزارِ پُر انوار کی زیارت کیلئے آتے ہیں۔ آپ کی وفات کے
بعد جس قدر روحانی فیض مخلوق اللہ کو پہنچ رہا ہے، اس کی نظیر نہیں ملتی۔

اعلیٰ حضرت خواجہ غلام مرتضیٰ رحمۃ اللہ علیہ کے آباؤ اجداد کئی پشتوں سے متواتر
عالمِ باعمل اور ولی کامل چلے آتے ہیں۔ وادیٔ سُون سے حضرت قبلہ کے جدامجد حضرت صدر
الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے مخلصین کے تقاضے کے پیشِ نظر اس علاقے میں تشریف لائے اور
جھاوریاں کے قریب چک موسیٰ میں آباد ہوئے۔ چک موسیٰ میں سڑک کے متصل ایک کنواں
اور اس کی متعلقہ زمین آپؒ کے دادا کی ملکیت تھی۔ لیکن آپ کے والد ماجد بیربل شریف
منتقل ہو گئے۔ اس لیئے موروثی مزارعین مذکورہ زمین پر قابض ہو گئے۔ آپؒ کے والد ماجد جن
کا اسمِ مبارک حضرت محمد اسلم رحمۃ اللہ علیہ تھا؛ ظاہر و باطن میں کامل اور صلاحیت و تقوے
میں بے مثل تھے۔ نہایت کریم النفس، متورع، متقی، عابد اور پارسا تھے۔ اعلیٰحضرت
قدس سرہٗ ۱۲۵۱ھ میں بیربل شریف ضلع سرگودھا میں تولد ہوئے۔ ولادت باسعادت سے
پہلے ایک کامل بزرگ نے آپؒ کے والد ماجد کو آپ کی پیدائش اور علوِ مرتبت کی بشارت
دے دی تھی۔ آپؒ کی عمر تیرہ ۱۳ برس کی تھی کہ والد ماجد کا انتقال ہو گیا تھا۔ حضرت قبلہ قدس
سرہٗ نے والد ماجد کی زندگی ہی میں قرآن مجید حفظ کر لیا تھا۔ اور رسائل فارسی تا سکندر
نامہ اور علمِ فقہ کی بعض فارسی کتابیں اور فتاویٰ مثلاً صلوٰۃ مسعودی وغیرہ ختم کر لیئے تھے۔
والد ماجد کی وفات کے بعد حصولِ علم کے لیئے چند جگہوں پر تشریف لے گئے لیکن جمعیت
خاطر نے کسی جگہ ساتھ نہ دیا۔ بالآخر اعلیٰ حضرت غلام نبی للّٰہی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر
ہوئے۔ ایامِ طالب علمی میں آپؒ نے قطب الاقطاب حضرت مولانا غلام محی الدین قصوری
رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ پر بیعت کی اور سلوک طریقہ نقشبندیہ مجددیہ کا اکتساب اپنے اُستاد
اعلیٰ حضرت للّٰہیؒ سے کیا جو حضرت غلام محی الدین قصوریؒ کے بڑے خلفاء میں سے تھے

فارغ التحصیل ہو کر جب اپنے دولت خانہ بیربل تشریف لائے تو چونکہ آپ کو تدریس علم کا نہایت شوق تھا، اِس لئے اعلحضرت للہیؒ نے چند طلباء تبرکاً آپؒ کے حوالے فرمائے پھر آپؒ کے پاس طلبا کا اِس قدر ہجوم ہوا کہ مسجدِ مبارک میں باوجود وسعت کے قدم رکھنے کی جگہ نہ ملتی تھی۔ آپؒ رات دِن پڑھانے میں مشغول رہتے تھے۔ بڑے ذکی اور متبحر آدمی آپؒ کی شہرت سُن کر حاضر ہوئے۔ کتابوں کے ساتھ آپؒ کو ایسا شغف تھا کہ جو کچھ آتا، آپؒ کتابوں پر خرچ کر دیتے تھے۔ کتب خانہ میں ایک ایک کتاب کے دس دس گیارہ گیارہ نسخے موجود تھے۔ جو کتاب نایاب کہیں سُنی، حتی الامکان اس کے حاصل کرنے کی کوشش فرماتے۔ اگر اصل نہ ملی تو نقل کرا لی۔ درسی کتابوں کے حواشی اور شروح جہاں کہیں دستیاب ہوئے، سب منگوا لئے۔ آپؒ طالب علموں پر نہایت شفقت اور مہربانی رکھتے تھے۔ ہر طالب علم یہی سمجھتا تھا کہ جس قدر آپ کی مہربانی مجھ پر ہے، ایسی کسی پر نہیں۔

اعلحضرت بیربلویؒ کی تعلیم اور اعلیٰ لیاقت کی شہرت دُور دور تک پھیل چکی تھی اور اس عہد کے علماء میں کوئی آپؒ کے ہم پلہ نہ تھا۔ کم گوئی آپؒ کی جبلی عادت تھی۔ ہاں اگر اگر کوئی اپنی تعلّی ظاہر کرتا تو آپؒ کوئی نہ کوئی سوال ایسا کرتے جس کا جواب دینے سے عاجز آکر آپؒ کے علمی تبحر اور علوِ مرتبت کا قائل اور معترف ہو جاتا۔

اگرچہ ایامِ تعلیم ہی میں حضرتِ اعلےٰ للہی رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کی باطنی تربیت فرمائی تھی۔ مگر تکمیل علیٰ وجہِ الکمال کے پیشِ نظر آپؒ کئی مرتبہ اپنے استاد و مرشد کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے۔ اعلیٰ حضرت للہیؒ ہمیشہ آپؒ کی توجہ کے لئے علیحدہ وقت متعین فرماتے اور دیر تک توجہاتِ خاصہ سے شرف بخشتے۔ اعلیٰ حضرت للہیؒ نے آپؒ کو اجازتِ کاملہ و خلافتِ عظمےٰ عطا فرما کر مسندِ ارشاد پر جلوہ افروز ہونے کا حکم دیا۔ ابتدا میں آپؒ لوگوں کو بیعت بہت کم کرتے تھے۔ جو شخص خواہش مند ہوتا اسے اعلحضرت للہیؒ کی خدمت میں جانے کا ارشاد فرماتے۔ البتہ خدام کے کہنے پر کسی نہ کسی وقت توجہ فرماتے۔

اعلیٰ حضرت للہیؒ کی وفات کے بعد اہلِ ارادت و محبت کو بیعت کرنا شروع کیا۔ داخلِ طریق کرنے کے بعد سالک کو مقامِ قلب دکھا کر خیالِ قلب سے اسمِ ذات

یعنی اللہ اللہ پڑھنے کا ارشاد فرما کر توجہ میں بٹھایا جاتا، اور بعد میں ارکانِ اسلام کی ادائگی کی تاکید کے ساتھ درود شریف اور استغفار پڑھنے کی تلقین فرماتے تھے۔

سردار شیر خان مرحوم اور سردار حاجی فتح خان مرحوم نے جو کوٹ بھائی خان کے رئیس تھے، حضرت قبلہ بیربلوی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں ستر، اسّی بیگھہ زمین کا ایک ٹکڑا اندر کر دیا تھا۔ جب یہ زمین نہری آب پاشی سے آباد ہوئی تو آپؒ نے وہاں ایک عالی شان مسجد کی بنیاد رکھی۔ آخر عمر میں آپؒ کو فالج کا مرض ہو گیا، جس کا اثر سال بھر ایامِ وفات تک قائم رہا۔ ابتدائے مرض میں بڑی شدت شروع ہوئی۔ شدتِ مرض کا یہ حال تھا کہ اکثر غنودگی اور بے خودی طاری ہو جاتی تھی۔ آخر میں مرضِ اسہال لاحق ہوئی اور آپؒ نے ۱۵ رجب المرجب ۱۳۲۱ھ کو وصال فرمایا۔

قطب العالم اعلیٰ حضرت بیربلوی رحمۃ اللہ علیہ کے مسندِ ارشاد پر متمکن ہونے سے لے کر تادمِ حیات آپؒ کے چشمۂ علم و عرفان سے ہزارہا لوگوں نے فیض حاصل کیا۔ بالخصوص پنجاب کے اضلاع ساہی وال (منٹگمری)، قصور، لاہور، شیخوپورہ، گوجرانوالہ، گجرات اور سرگودہا کے اکثر لوگ آپؒ کے علمی اور باطنی فیض کے زیرِ اثر تھے۔ اور ان علاقوں میں آپؒ کے مریدوں اور مخلصوں کی کافی تعداد موجود تھی۔ اور میری نظر میں ان علاقوں کے کئی ایسے گھرانے اب بھی موجود ہیں، جن کا باطنی تعلق اس آستانۂ عالیہ اور خانوادۂ عظمٰے سے تین تین چار چار پشتوں سے چلا آرہا ہے۔ قطب العالم حضرتِ اعلیٰ بیربلویؒ کے تین صاحبزادے تھے، جن کے نام حضرت حافظ احمد سعید صاحب رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولینا محمد سعید صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولینا مولوی حافظ غلام رسول صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہیں تینوں صاحبزادگان کی اولادیں دینی و دنیاوی جاہ و حشمت کے ساتھ زندگی بسر کر رہی ہیں۔

زیرِ نظر کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے تین ابواب میں اعلٰے حضرتؒ کے حالاتِ زندگی، اوصاف اور معمولات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ چوتھا باب دین اللہ کے نام سے ہے اس میں اعلحضرتؒ کے تعلیمی و تدریسی شغف کا احاطہ کیا گیا ہے۔ پانچویں باب میں مساجد کے ساتھ آپؒ کا اُنس اور ان کی تعمیر کا ذکر موجود ہے۔ چھٹے باب میں مخلوق اللہ کے ساتھ

تعلّق کا بالتفصیل ذکر کیا گیا ہے۔ اور ایسے تمام لوگوں کا ذکر شامل ہے، جن کا کسی نہ کسی صورت میں آپؒ کے ساتھ تعلق رہا ہے۔ ساتویں باب میں حضرتؒ کے خلفاء کا ذکر کیا گیا ہے۔ مولوی عبد الرسول مرحوم مولّفِ انوارِ مرتضویہ نے آپؒ کے خلفاء اور مخلصین کے ضمن میں تقریباً پچپن ۵۵ حضرات کے نام اور مختصر حالات تحریر فرمائے ہیں۔ لیکن حضرت قبلہ عالم رحمۃ اللہ علیہ مؤلف نے صرف مندرجہ ذیل حضرات کا خلفائے مجاز کے ضمن میں بالتفصیل ذکر فرمایا ہے۔ اور اس ضمن میں آپؒ لکھتے ہیں:

"اب میں ان مخلصین حضرات کا ذکر کرتا ہوں جن کو مجاز خیال کیا جاتا ہے۔ اور جن پر عوام کو اعتمادِ بزرگی تھا"

۱۔ قاضی غلام محمد صاحبؒ شاہ پوری

۲۔ پیر سلطان سکندر شاہ صاحبؒ خوشابی

۳۔ قاضی عطا محمد صاحبؒ، نلّی ضلع خوشاب

۴۔ قاری اللہ بخش صاحبؒ، فیض پور ضلع شیخوپورہ

۵۔ صوفی محمد ابراہیم صاحب قصوری

زیرِ نظر تذکرہ میں مولوی محبوب عالم سوہادیؒ کا ذکر خلفاء کے ضمن میں موجود نہیں، جو اعلیٰ حضرتؒ کے نہایت مخلص مریدوں میں سے تھے۔ ظاہری و باطنی علوم میں درجہ کمال رکھتے تھے۔ اردو، عربی اور فارسی زبان میں انشا پردازی اور فنِ شعر گوئی میں کمال ملکہ حاصل تھا۔ اعلیٰ حضرتؒ کے مناقب میں کئی قصیدے لکھے، جن سے ان کی والہانہ عقیدت اور محبتِ شیخ کا اندازہ ہوتا ہے۔ مولوی صاحب چونکہ اعلیٰحضرتؒ کی زندگی ہی میں وفات پا چکے تھے۔ اس لئے معلوم ہوتا ہے، کہ اس تذکرہ میں حضور قبلۂ عالمؒ نے ان کا ذکر نہیں فرمایا۔ حالانکہ آپؒ اسی تذکرہ میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ اعلیٰحضرتؒ کے مریدوں میں صرف مولوی محبوب عالم سوہادیؒ تھے، جو اعلیٰ باطنی استعداد کے مالک تھے۔ اسی طرح اعلیٰحضرت پیر بلویؒ کی پہلی سوانح حیات "انوارِ مرتضویہ" میں صوفی محمد ابراہیم قصوریؒ کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ حالانکہ حضور قبلہ عالمؒ نے کتاب کے آخر میں صوفی صاحب کے اخلاص کا نہایت اہتمام اور تفصیل کے ساتھ ذکر فرمایا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ مؤلفِ

انوارِ رضویہ' کو صوفی صاحب کے اخلاص اور مقام کے بارے میں اتنی معلومات نہیں تھیں۔

سوانح نگاری کے تاریخی پس منظر، اہمیت اور افادیت کے متعلق ابتداءً عرض کر چکا ہوں۔ تاہم فنی لحاظ سے زیرِ نظر تذکرہ کا جائزہ لینے کیلئے ضروری ہے کہ قارئین کو دوبارہ اس طرف متوجہ کردوں۔ سوانح نگاری اور تاریخ نگاری اگرچہ فنی لحاظ سے دو مختلف علمی و ادبی اسلوب ہیں، لیکن فکری لحاظ سے ان میں کئی مماثلتیں ہیں۔ دونوں میں بنیادی فرق یہ ہے، کہ تاریخ میں زمانے کو دوربین سے دیکھا جاتا ہے۔ لیکن سوانح میں ایک فرد یا شخصیت کو خوردبین سے دیکھا جاتا ہے۔ تاریخ زمانے کو اپنا موضوع بناتی ہے، اور سوانح ایک فرد سے بحث کرتی ہے تاریخ میں زمانے اور قوم کے حوالے سے افراد کی طرف سفر کیا جاتا ہے، لیکن سوانح میں فرد سے جماعت ملک اور قوم کی طرف بڑھا جاتا ہے۔ تاریخ میں ہم صرف بڑے اور عظیم واقعات پیش کر سکتے ہیں۔ اور اس کے ذریعے مملکت و سیاست کے ایوان اور فلک بوس کاخِ حکومت ہی کا نظارہ کر سکتے ہیں، جبکہ سوانح نگار، افراد کے نجی گھروندوں میں جھانک سکتا ہے۔ تاریخ اور سوانح میں اسی بنیادی فرق کے پیشِ نظر، سوانح عمری کا خاص وصف یہ ہے کہ وہ ہمیں 'آدمی' اور 'انسان' سے روشناس کراتی ہے۔ مختصر یہ کہ سوانح عمری کسی شخص کی مکمل زندگی کی مصوری کا نام ہے' جس میں اس کے داخلی اور خارجی احوال اپنی پوری آب و تاب سے جلوہ گر ہوتے ہیں۔ اس لئے سچائی، غیر جانب داری اور صداقت کا پہلو ہمیشہ سوانح نگار کے پیشِ نظر رہنا چاہیئے۔

برصغیر میں مسلمانوں کے انحطاط اور اردو ادب کے ابتدائی دور میں اچھی اور معیاری سوانح عمریاں سامنے آئیں، اور بالخصوص حالی اور شبلی نعمانی نے مشاہیرِ اسلام پر بہت سی گرانقدر بیاگرافیاں لکھیں۔ غلامی کے دور میں قومی بیداری پیدا کرنے کیلئے اس بات کی اہم ضرورت تھی، کہ نشاۃِ ثانیہ کے لئے اسلاف کی زندگی کے جامع اور مکمل نمونے قوم کے سامنے لائے جائیں اس مقصد کے ساتھ ساتھ اردو ادب میں سوانح نگاری کے اسلوب کو بھی ایک نئی جہت نصیب ہوئی۔ لیکن یہ امر واقع ہے کہ اولیائے کرام کے تذکروں میں آج تک کوئی نمایاں جدت دیکھنے میں نہیں آئی۔ اولیائے کرام کے سوانحی تذکرے لکھنے والوں نے وہی روایتی انداز اپناتے ہوئے ابتداءً اپنے سلسلہ کے شجرۂ نسب کے تمام بزرگوں کے حالات قلم بند کئے، جن کا بار

بار تکرار آج تک جاری ہے۔ بہر حالات زندگی، ملفوظات، کرامات، معمولات اور مکاتیب درج کر کے ضخیم کتابیں وجود میں لائی گئیں۔ لیکن ان سے سوانح عمری کا وہ مقصد حاصل نہ ہو سکا جو فی الواقع ہونا چاہیئے تھا، کہ شخصیت کے داخلی اور خارجی احوال کو ایسے شستہ انداز میں پیش کیا جائے کہ وہ پڑھنے والے کو براہِ راست متاثر کر سکیں۔ بقول حضرت قبلہ مرشدم:

"کئی ایک رسالے تصوّف کے شائع ہو رہے ہیں۔ لیکن غور سے دیکھو تو سلف صالحین رحمۃ اللہ علیہم اجمعین کی تصانیف کے تراجم کے سوا ایک حرف بھی نیا نظر نہیں آتا۔ علاوہ ازیں اگر موجودہ وقت میں کوئی اس فنِ شریف کے متعلق تصنیف نظر آتی ہے تو بزرگوں کے حالات، سوانحات اور تذکرے ہیں۔ وہ بھی ایسے رُوکھے پھیکے کہ قال کی چاشنی، نہ حال کا ذوق۔"

(انقلاب الحقیقت ص ۵)

مجھے یہ کہنے میں چنداں تامّل نہیں کہ میرے قبلہ و کعبہ حضرت صاحبزادہ محمد عمر صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے "انقلاب الحقیقت" لکھ کر سوانح کے اسلوب کو ایک نیا انداز بخشا، اور روایت سے ہٹ کر تذکرہ نویسی میں ایک گونہ جدّت پیدا کی۔ اس ضمن میں آپؒ خود فرماتے ہیں:

"ایسے وقت اور ایسے حال میں ایک ایسی تصنیف پیش کرنا، جو قال وحال کو یکساں، متوازی صورت میں دکھائے اور اپنی مجتہدانہ تحریر سے تقلیدی راستہ چھوڑ کر ایک نرالا اور نیا ڈھنگ پیش کر کے دعوتِ حق کا پرچم ہلائے تو کیا ذَالِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ کا نمونہ نہ ہوگا!"

(انقلاب الحقیقت ص ۵)

فی الواقع "انقلاب الحقیقت" حضرت قبلہ مرشدم رحمۃ اللہ علیہ کی ایسی شاہکار تصنیف ہے جس کی نظیر فی زمانہ نہیں ملتی۔ اس کی اصل خوبی جامعیت ہے جس کی وجہ سے نہ تو یہ کتاب سوانح حیات کے زمرے میں آتی ہے، اور نہ ہی محض تذکرہ معلوم ہوتا ہے۔ اس میں ایک عنصر جو بڑی خوبی سے سمویا گیا ہے، وہ آٹو بیاگرافی (خود نوشت سوانح) کا ہے یعنی کسی کے ذکر کے ساتھ اپنے داخلی اور خارجی احوال کو بھی نہایت خوبی سے بیان کیا گیا ہے۔ اس پر مستزاد یہ

کہ واقعات اور حالات سے استخراج کر کے تصوف کے حقائق اور معارف کو بڑے منطقی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ دو تین اسالیب کو یکجا کرنا نہ صرف مشکل کام ہے، بلکہ ادب میں ایک نئے اسلوب کا اضافہ بھی ہے۔ اور اگر طرزِ تحریر کو لیا جائے تو بقول ڈاکٹر دِل محمدؐ قریشی مرحوم:

"اس کی ایک اور خصوصیت یہ ہے، کہ اِس کا ہر لفظ سوز و گداز سے بھرپور ہے۔ اور ساری کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے، کہ یہ مبتدی اور منتہی کے لئے یکساں مفید ہے۔ جہاں تک ایک صوفی کے لئے رہنمائی کا کام دیتی ہے، وہاں ایک فلسفی طبیعت کیلئے دلیلِ مبین بھی ہے۔"

ہر ادیب کے طرزِ تحریر میں کوئی ایسا وصف موجود ہوتا ہے، جو اسے دوسروں سے منفرد مقام عطا کرتا ہے۔ اور تحریر کے مختلف زاویے، جیسے ادب، تحقیق، روایت، منظر نگاری اور پلاٹ وغیرہ ادیب کی انفرادیت کی پہچان بنتے ہیں۔ اِس حوالے سے دیکھا جائے تو آپؒ کے طرزِ تحریر میں ادب اور تحقیق کا حسین امتزاج موجود ہے۔ الفاظ کے موزوں انتخاب کے ساتھ آپؒ شُستہ اور برجستہ جملے اِستعمال کرتے ہیں، جس سے قاری براہِ راست متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ واقعات کو بیان کرتے وقت آپؒ پورے ماحول کو اپنے ساتھ لئے چلتے ہیں، اور جس فرد یا چیز کا جہاں ذکر کرتے ہیں، اس کے تمام پہلوؤں کو اس انداز میں سمیٹتے چلے جاتے ہیں، جیسے آپؒ یہ بات کسی مجلس میں بیان فرما رہے ہیں۔ اور یہ خوبی بہت کم ادیبوں میں دیکھنے میں آئی ہے۔

زیرِ نظر تصنیف اعلیٰ حضرت بیربلویؒ کی پہلی سوانح حیات نہیں، بلکہ "انوارِ مرتضویہ" جیسی جامع سوانح حیات پہلے بھی موجود ہے، جو اعلیٰحضرت بیربلویؒ کے حالاتِ زندگی کا ایک انمول خزانہ ہے۔ اور اس میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں، جو کسی روایتی سوانح حیات میں موجود ہونی چاہئیں۔ لیکن میں عرض کر چکا ہوں کہ حضرت قبلہ عالمؒ نے اِس سلسلے میں جس نئے اسلوب کی بنیاد رکھی، اس کا تقاضا تھا کہ آپؒ اپنے جدِ امجد رحمۃ اللہ علیہ کے حالات اسی انداز میں تحریر فرماتے۔ لہٰذا آپؒ نے مختلف اوقات میں اعلیٰ حضرت بیربلوی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات تحریر فرمائے اور ان کی نقول کا اہتمام بھی فرمایا، تاکہ تحریر کو پڑھنے میں دِقّت نہ ہو۔ آپؒ کی زندگی میں

ماہنامہ "سلسبیل" میں اس کی کئی اقساط شائع ہوئیں۔ لیکن بوجوہ سارے حالات منظرِ عام پر نہ آسکے۔ حضور قبلہ عالمؒ کی زبردست خواہش تھی کہ تمام حالات شائع ہوں اور بندہ حضورؒ کی اس خواہش سے واقف تھا۔ اس لیئے دفتر ادارہ تصوف میں جب مسودات کی کاپیاں نظر سے گزریں تو بندہ نے حضرت قبلہ حاجی فضل احمد صاحب مدظلہٗ سے اس مسودہ کی تدوین کی اجازت چاہی، جنہوں نے کمال مہربانی سے اجازت مرحمت فرمائی۔

قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اس کی تدوین میں مجھے حضور قبلہ عالمؒ کی توجہ سے کہیں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ جہاں کہیں کوئی تردد پیدا ہوا تو مسودہ کی کاپیوں سے ہی رہنما اشارے ملتے گئے۔ جو بعض آپؒ کے اپنے لکھے ہوئے تھے۔ اور ایسا محسوس ہوتا، جیسے حضور قبلہ عالمؒ خود رہنمائی فرما رہے ہیں۔ اس کا مسودہ کئی سال میرے پاس رہا لیکن مالی لحاظ سے اتنی ہمت نہ تھی کہ اس کی اشاعت کا بوجھ برداشت کرسکوں۔ پچھلے عرس مبارک پر حضرت قبلہ قاضی محمد رضا صاحب مدظلہٗ سے درخواست کی تو انہوں نے بصد شوق طباعت کا بار اٹھانے کی رضامندی ظاہر فرمائی۔ جس سے مجھے بڑی تقویت حاصل ہوئی۔ جناب قبلہ قاضی صاحب مدظلہٗ کو "انوارِ مرتضویہ" کی دوبارہ اشاعت کا اعزاز بھی حاصل تھا اب یہ سعادت بھی انہی کے حصہ میں آئی۔

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۔

خاکپائے آستانہ عالیہ بیریل شریف
غلام عابد خان
I-46 صوبڑا اسٹی ـــــ تربیلہ ڈیم

مورخہ: ۱۸ر جولائی سنہ ۱۹۸۷ء

باب اوّل

حالاتِ زندگی

شُنیدہ کے بُود مانندِ دیدہ

ذی الحجہ ۱۳۰۵ھ کو میری پیدائش ہوئی اور ۱۳۲۱ھ کو حضرت اعلیٰ (نوراللہ مرقدہٗ) نے وصال فرمایا۔ اِس لحاظ سے میری عمر اس وقت ساڑھے سولہ برس کی تھی۔ میری ہوش مکمل تھی۔

حضرت قبلہ میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں جب پہلی حاضری ہوئی، تو فرمایا: حضرت صاحب کو دیکھا تھا؟ عرض کیا۔ جی۔ دیکھا تھا۔ فرمایا، کہ اچھی طرح دیکھا؟ عرض کیا کہ اچھی طرح۔ اِس پر آپ نے فرمایا کہ جو کچھ وہ کرتے تھے تم بھی کرو تو تم بھی وہی کچھ ہو۔

مقصود یہ ہے کہ اعلحضرتؒ کا نقشہ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ پھر ایک فقیر کی صورت وسیرت کا نقشہ بھلا فقراء کی صورت وسیرت اور ان کی مجالس کے نقشے کبھی آنکھوں سے نکلتے ہیں؟ کبھی نہیں نکلتے۔

پھالیہ کے ایک مدرّس مرحوم نے سجادہ نشین حضرت جلالپوریؒ کی خدمت میں جب آپ پھالیہ ضلع گجرات کے دورہ تبلیغی پر تشریف فرما تھے۔ عرض کی کہ آپ کا یہ ٹھاٹھ یہ جاہ وجلال تو میری آنکھوں سے جاتا رہے گا لیکن حضرتِ اعلےٰ جلالپوریؒ کا کھُلا گریبان کسی وقت بھی میرے دل سے فراموش نہیں ہوتا۔

غرض اولیاء اللہ کی صُورت وسیرت میں ایک دلکشی اور دل فریبی پیدا ہو جاتی ہے جو دیکھنے والے کے دل پر بیٹھ جاتی ہے اور مرتے دم تک نقشہ دل سے نہیں جاتا۔ حضرت قبلہ جدّ امجد رحمۃ اللہ علیہ کی صورت اتنی پسندیدہ اور مطبوع فطرت تھی کہ دیکھنے والا خود بخود آپ کی قطبیت کا قائل ہو جاتا تھا۔ حضرت قبلہ میاں صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ بادشاہی مسجد میں جب سے میں نے آپ کو دیکھا اسی وقت اُن کی صُورت میرے اندر چلی گئی۔

صُورت کیا تھی، ملک صاحب خان مرحوم، ملک عمر حیات خاں صاحب کے والد جب میکھڑ قریب پیربل شریف ا ہوتے تھے تو اُن کا ایک میراثی جب حضرتؒ کی زیارت کرکے واپس گیا تو ملک صاحب سے کہنے لگا، کہ میں نے آج ابو حنیفہؒ کو دیکھا ہے۔ ملک صاحب نے کہا وہ کیسے؟ کہا کہ جب میں نے

میاں صاحب بیربل شریف والوں کا چہرہ دیکھا تو مجھے یقین ہو گیا کہ ابو حنیفہؒ کا یہ چہرہ ہے۔ یعنی اپنے مذہب کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ہیں۔

مذہب نے اجازت نہیں بخشی ورنہ اگر حضرت کا کوئی فوٹو ہوتا اور میں آپ کے سامنے پیش کرتا تو یقیناً آپ حیا و علم کا مجسمہ اُسے پاتے اور صورت، خود اپنے علم وحیا کی صورت آپ کے سامنے پیش کرتی۔

آپ کا قد میانہ۔ رنگ گندمی۔ آنکھیں متوسط۔ ریش مبارک میانہ اور سینہ تک۔ آواز پست۔ قدم مبارک نازک، پتلے۔ رفتار مبارک معتدل نہ سست نہ تیز۔ مسجد کے اندر صحن میں یا سجادہ پر ایک مورتِ بے جان کی طرح تکیہ لگائے ہوئے اور پاؤں پھیلائے ہوئے، گاہے نگاہ بلند آسمان پر اور گاہے نگاہ افق پر اٹھتی بیٹھتی رہتی تھی لیکن سامنے بیٹھنے والے پر نظر نہ جمتی تھی۔ ہمیشہ قدرت کی نیرنگیوں میں مشغول و نگران حیران صدیق اکبرؓ کی طرح اَللّٰھُمَّ زِدْ حَیْرَتِیْ فِیْكَ کی جگہ اکثر ....

زیرکی بفروش و حیرانی بخر　　گوشِ خر بگذار و دیگر گوش خر

گنگناتے رہتے تھے۔ وَاللّٰہُ اَعْلَمُ یہ کسی اور عالم میں پھرتے ہوتے اور اس عالم کا پتہ دلنشان تک نہ ہوتا۔

ایک شنید، دید سے بڑھ کر ہوتی ہے اور ایک دید شنید سے بڑھ جاتی ہے یعنی کبھی تو شنید پر جب دید ہوتی ہے، تو شنید، دید کے برابر نہیں بیٹھتی، بلکہ کم اترتی ہے۔ اور دیکھنے والے پر کوئی اثر نہیں پڑتا، بلکہ شنید کو مبالغہ قرار دیتا ہے۔ لیکن بلند پایہ ولی اللہ کا حال اُلٹ ہوتا ہے۔ کہ شنید سے بڑھ کر دید نکل جاتی ہے اور زیارت کنندہ حیرت میں آجاتا ہے کہ کہاں شنید اور کہاں یہ جلوہ افروزی سُبْحَانَ اللہ۔ ہمارے حضرت ان اولیاءُ اللہ سے تھے کہ شنید سے بڑھ کر زیارت کرنے پر جلوہ افروز ہوتے تھے اور دیکھنے والا آپ کی جلوہ افروزی سے حیرت میں آجاتا تھا۔

کوئی زمیندار چودھری کسی مسئلہ کے دریافت کے لئے حاضر ہوا۔ اس کی مونچھیں بہت بڑی تھیں۔ حاضر ہونے سے پیشتر جب اُس نے کسی سے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے قیام کا پتہ لیا، تو

اس نے کہا کہ اِس صُورت میں حضرت کے سامنے نہ ہونا۔ وُہ متکبّر تھا، ویسے رعونت سے پُر
کہا۔ کیا ہو گا؟ ....!

اَور اُسی صورت میں حاضر ہو گیا۔ اور حضرتؒ نے جو نظر بھر کر دیکھا۔ اُسی وقت
اُٹھ آیا اور نائی سے مونچھیں کترنے کے لیئے کہا اَور ساتھ ہی کہا کہ جب مَیں حاضر ہوا اَور آپ
نے دیکھا تو مَیں نے سمجھا کہ آپ مجھے کھاتے ہیں۔ اَور میں شکستہ ہو کر رَہ گیا۔

غرض چہرے پر جلال ہی جلال تھا۔ اور خود بھی جلالِ حق میں ہر وقت غرق رہتے
تھے۔ اور کسی کو بھی یہ تاب نہ ہوتی تھی کہ ان کی خدمت میں کوئی کھلے دِل جرأت کے ساتھ
حاضر ہو۔ شاہ و گدا ایک صورت میں پیش ہوتے تھے۔ ایک بار کسی نے جنگلات کے افسر کو
شکایت کی، کہ حضرتؒ کے غلام سرکاری درخت کاٹ کر لائے ہیں۔ اس وقت عموماً بڑے
افسر انگریز ہوتے تھے۔ چنانچہ ایک انگریز تفتیش کے لیئے بیربل آیا اور مسجد کے باہر
کھڑے ہو کر کہا کہ وہ میاں صاحب کہاں ہیں جو شیشم کٹوا کر لائے ہیں لیکن کسی کو یارا نہ
ہوا کہ اسے جواب دے یا حضرت کو اِطلاع دے۔ آخر جب کئی بار اِصرار کیا تو لوگوں نے
اِشارہ کیا کہ آپ اندر مسجد میں ہیں۔ اِس پہ وُہ آپ کی نشست کی طرف بڑھا۔ جہاں
حضرتؒ کے چہرے پر نظر پڑی، انہیں قدموں سے واپس ہو گیا اور کہا کہ یہ کہاں اور وُہ
کہاں۔ یہ شکایت بیکار ہے۔ ایسی صُورت ایک دو دِن نہیں بلکہ روزمرّہ کا یہ عالم تھا۔ کسی کو
یارا نہ تھا کہ آپؒ کے سامنے آوارگی میں چلا جائے اَور چشم وا سے آپؒ کو دیکھے۔ ہر حاضر کی
نظر نیچے ہوتی تھی۔

اِس پر بے تعلقی کمال تھی۔ اَور لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُولَدْ کا عکسِ جمال کھلا نظر
آتا تھا۔ جیسے وہ ذاتِ اقدس اپنی وحدت میں کامِل ہے اُسی طرح آنحضرتؒ اپنی وُحدتِ
تخیل میں کامِل تھے۔ دوئی کا گذر نہ تھا۔ وُہ ذات تھی اَور یہ تھے۔ گویا حضورؒ کی آنکھیں
اس دربار پر لگا دی گئی ہیں، اور ہر آن ہر حال منتظرِ درگاہ ہیں۔

درس وتدریس اور تعلیم وتعلّم جاری تھا۔ لنگر خاصا وسیع تھا۔ صاحبزادے تھے پوتے
تھے۔ زوجہ محترمہ تھیں۔ غرض ایک پورے معاشرہ کے ذمّہ دار تھے۔ لیکن کسی سے سرگوشی نہیں

Marfat.com

مشورہ نہیں۔ کسی کام سے تعلق نہیں۔ ذمہ دار اصحاب اپنے شغل میں مصروف۔ خود مسجد کی اوٹ میں تکیہ زن، تشریف فرما ہیں۔ دنیاوی معاملات میں کوئی دخل نہیں۔ کسی خاص سے خاص مقرب سے گوشہ نشینی نہیں۔ صاحبزادگان کی کیا مجال کہ سوائے طلبی کے حاضر ہوں۔ درویش اور خدام کا تو کیا کہنا۔ پوتے آٹھ تھے لیکن تربیت و تعلیم کے سوائے دلچسپی کی کوئی بات نہیں۔ نہ ہنستے ہیں نہ روتے ہیں۔ ایک بحرِ ذخار کی طرح اپنی امواجِ تفکراتِ الٰہیہ میں ہر وقت غرق ہیں۔

میرے چھوٹے چچا صاحب قولنج کے مرض میں گرفتار ہو گئے۔ اور سخت مایوسی ہو گئی۔ سحری کا وقت تھا۔ اطلاع آئی۔ مسجد کے ساتھ گھر تھا لیکن یہ مردِ خدا اپنی مسند سے نہ اٹھے۔ دوا کا تو گذر ہی کیا۔ دعا تھی وہ بھی کسی کو معلوم نہیں کہ چند الفاظ فرمائے ہوں۔

آنحضرتؒ سرہند شریف کے عرس پر تیار تھے اور صبح سویرے روانگی کا پروگرام تھا۔ میرے والد علیہ الرحمۃ کو بھی ساتھ چلنے کا ارشاد تھا۔ جب تیاری کیلئے صبح اُٹھے۔ آپ حجرہ کی چھت پر تھے جو مسجد میں تھا۔ سیڑھی پر قدم نہ جما اور فرش مسجد پر آگرے۔ ران ٹوٹ گئی۔ گرمی کا موسم تھا۔ مسجد کے صحن کے جنوب میں گرے اور حضرت قبلہ مسجد کے شمال مسند رکھتے۔ لیکن استقامت کی یہ شان کہ وہاں سے یہاں تک چند قدم کا فاصلہ طے کر کے صاحبزادہ کے سرہانے نہ آئے۔ اور نہ دلجوئی کے لئے چند الفاظ بالمشافہ فرمائے۔ صرف ایک دن ان کا سفر ملتوی ہوا۔ والد قبلہ کو تو اسی حالت گھر چھوڑ گئے۔ اور دوسرے دن حضرت کا کوچ ہو گیا۔

عموماً بچوں سے محبت ہوتی ہے اور خصوصاً بڑھاپے میں۔ ہم چھوٹے چھوٹے تھے۔ اول تو ہم بچے سامنے بھی نہیں ہوتے تھے۔ اگر کسی وقت دم یا تعویذ کیلئے پیش بھی کیا جاتا سر پر ہاتھ نہ پھیرتے۔ بتاشے شیرنی کے اس زمانہ میں عام ہوتے تھے۔ چند بتاشے اپنے ہاتھ سے دے دیتے تھے۔

مسجد کے ساتھ ہی ملحقہ آپ کا دولت کدہ تھا۔ اور حجرہ سے ہی دریچے گھر کو لگے ہوئے تھے۔ ایک نچلے حصّہ سے اور ایک بالاخانہ سے۔ جب کبھی گھر تشریف لے جاتے تھے، تو

دریچوں سے کسی نے آپ کو گھر جاتے نہیں دیکھا۔

مال مویشی، گھوڑے، خچر تھے۔ ان کے چارے وغیرہ کا انتظام، کچھ زمین سے، اَور کچھ اِدھر اُدھر سے۔ لیکن آپ کو کچھ پتہ نہیں۔ یہ بھی پتہ نہیں کہ کیا کیا مال مویشی ہماری حویلی میں ہے۔ اَور کون خدمت گذار کام کرتا ہے۔

ایسے ہی مسجد کا اور تعلیم و تعلم کے اوقات کا مکمل انتظام تھا۔ لیکن خود کسی کام میں دخیل نہ تھے۔ اپنے اپنے کام اپنے اپنے ذمّہ دار کرتے۔ بعینہٖ یہی حال حضرت قبلہ شاہ صاحب گولڑوی رح کا تھا۔ وُہ خود تمام امورات سے الگ اپنی لگن میں مست تھے۔ اگر کسی وقت طبیعت میں آیا تو چاشت کے وقت مجلسِ عامہ میں تصوّف کے بعض اہم مسائل پر گفتگو فرمایا کرتے نہ لنگر سے واسطہ تھا نہ نذر و نیاز سے۔ وُہ تمام کچھ خدّام کے حوالے تھا۔

اصل میں صاحبِ جلال بزرگ اسی عادت کے ہوتے ہیں۔ خُدائے قدّوس کی جلالی صفت بے نیازی میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اَور بے نیاز زندگی میں اپنے اوقات گذارتے ہیں۔

حضرت قبلہ رحمۃ اللہ علیہ بچپن ہی میں اپنے والد رحمۃ اللہ علیہ کا سایہ گذار بیٹھے تھے جُب وقت قریب آیا تو غالباً سید جلال شاہ صاحب یا کسی ان کے دُوسرے بزرگ نے ہمدردانہ طور پر خود حضرت رح کے والد محمد اسلم رحمۃ اللہ علیہ سے کہا کہ آپ اس بچہ کو کسی کے حوالہ کر دیں۔ جیسے اس وقت دستور تھا۔ لیکن آپ نے سر پر حضرت کے ہاتھ پھیرتے ہُوئے فرمایا۔ یہ اللہ کے سپُرد ہے۔ دوبارہ کہا تو دوبارہ بھی یہی کہا۔ شاہ صاحب کا مقصد تھا کہ ہمارے تعلقات کی وجہ سے ہمارے کسی بزرگ کے حوالہ کر دیں۔ لیکن جواب یہی ملتا رہا کہ حوالہٗ بخُدا۔

لیکن غور کیا جائے کہ اللہ سے بڑھ کر کون اس قابل ہے کہ جس کے حوالے اولاد جیسی چیز کی جائے۔ وہی ہے۔ جو اس فانی دنیا میں ایک لاثانی پرورش اور تربیت کا مالک ہے۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں، وُہ ہمیشہ اُسی پر آسرا لگاتے ہیں۔ وہی شاہ صاحب حضرت رح کو بلہ شریف چھوڑ آئے۔ اعلحضرت مولانا غلام نبی صاحب رحمۃ اللہ علیہ للّٰہی اُس وقت تازہ تازہ پشاور سے فارغ التحصیل ہو کر تشریف لائے۔ بازارِ علم گرم تھا۔

چنانچہ چند سالوں میں مروجہ علم سے آپ فارغ ہوگئے۔ لیکن اس وقت درسِ نظامی میں سوائے فقہ، اصول فقہ، منطق اور صرف و نحو کے کچھ نہ پڑھایا جاتا تھا۔ اگر کسی نے خاص توجہ دی تو جلالین شریف پڑھا دی جو صرف نحو کی تفسیر خیال کی جاتی ہے اور بس۔

لیکن فارغ ہونے کے بعد مسندِ تعلیم و تعلّم پر قدم رکھا تو آپ نے مطالعہ شروع کیا ساتھ ہی کتب کی خریداری شروع ہوئی۔ جو پیسہ آتا تھا، کتب کی خرید میں صرف ہوتا۔ لاہور مستقل اپنے تعارف والوں میں سے ایجنٹ اور نمائندے رکھے ہوئے تھے۔ جو آپؒ کو تازہ تازہ اشاعتوں کی اطلاع دیتے تھے۔ اور آپؒ ان کے ذریعے کتب خرید فرماتے تھے یہاں تک کہ یہاں کا کتب خانہ اپنی مثال آپ ہوگیا۔ ہر علم کی کتب کے ذخیرے موجود ہوگئے۔ کسی علم کی کوئی کتاب ایسی نہیں جو آپ کی نظر سے بہ تمامہ نہ گزری ہو۔ دن بھر تعلیم و تدریس کا شغل رہتا تھا۔ لیکن راتوں مطالعہ کیا جاتا تھا۔ اور آپ کا اکثر حصۂ رات، بیداری اور مطالعہ میں گزرتا تھا۔ چونکہ اعلیٰحضرتؒ کا حافظہ نہایت بلند تھا۔ جو چیز ایک بار نظر سے گذر جاتی، وہ ہمیشہ کے لئے ذہن میں محفوظ ہو جاتی تھی۔

حکیم نورالدّین جو مرزائیت کے خلیفہ اوّل تھے اپنے مسکن بھیرہ میں مقیم تھے۔ اور اپنی علمیّت کے بل بوتے وہ حنفیت سے وہابیت میں چلے گئے تھے ان کے علم کا کسے انکار ہے؟ اور وہ اپنے علوم میں یگانۂ روزگار تھے حتّٰی کہ علم نے ہی ان کو تباہ و برباد کیا۔ قَالَ اِنَّمَا اوتیتہ علیٰ علم کے مطابق وہ ایسے گرے جو سنبھل نہ سکے۔ کوٹ بھائیخان اپنی وہابی برادری میں آئے اور کسی مسئلہ کی چھیڑ چھاڑ شروع ہوئی۔ کوٹ بھائیخان بیربل سے دو میل کے فاصلے پر ہے حضرتِ اقدسؒ کو ان سے بات چیت کرنے کے لئے لے گئے۔ آمین بالجہر کا جھگڑا تھا۔ ہمارے حضرتؒ نے فرمایا۔ کیوں بلند آواز سے آمین کہی جائے؟ کہا کہ بخاری شریف میں آتا ہے: واذ قال الامام ولا الضالین فقولوا آمین۔ بخاری کا طریقہ ہے، جب قولوا کا لفظ استعمال کرے تو اس سے مقصود بلند آواز سے کہنا ہوتا ہے تو جھٹ آپ نے فرمایا کہ بخاری میں آتا ہے کہ اِذْ قَالَ الْاِمَامُ سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ فقولوا رَبَّنَا لَکَ الْحَمْدُ۔ پھر کیوں بلند آواز سے رَبَّنَا لَکَ الْحَمْدُ نہیں کہا جاتا۔ اس پر ایک اور حدیث حکیم صاحب نے پڑھی۔ آپؒ نے

کہا کہ یہ کس کتاب میں ہے۔ حکیم صاحب نے کہا۔ بخاری میں۔ اس پر وقت شام ہوگیا اور دُوسرے دِن پر بحث ٹھہری۔ لیکن آپؒ نے فرمایا۔ بخاری میں یہ نہیں۔ لیکن حضرت کو بعد میں خیال آیا کہ اتنا بڑا عالم ہے۔ کہیں ایسے نہ ہو کہ موجود ہو۔ آپؒ نے رات بھر میں بخاری تمام آنکھوں سے نکال دی لیکن وُہ حدیث نہ پائی۔ لیکن حکیم صاحب راتوں رات بھیرہ چلے گئے۔ اُور میدان ایسا ہار گئے کہ بھیرہ کی اقامت بھی ہمیشہ کیلئے ترک ہوگئی۔

یہ حضرت رحمتہ اللہ علیہ کی بڑی کرامت تھی کہ آپؒ نے جس سے بحث کی وُہ پھر ہمیشہ کے لئے ہار گیا۔ جس کی مثال کھڈ کا مباحثہ ہے۔ وُہ بھی ہندوستان سے فارغ ہو کر آئے تھے اور غیر مقلدانہ رنگ لے کر آئے تھے۔ غالباً یا شیخ عبد القادر جیلانی شیئاً للہ پر بحث ہوئی۔ آپؒ مقابل طرف نہ تھے لیکن ثالث تھے۔ بعض وقت جب اپنا پہلو کمزور ہمارے عالم پیش کرتے تھے تو ان کی رہنمائی فرماتے تھے۔ ایک بار ایک حریف مولوی صاحب نے کہا، کہ آپ ثالث ہیں۔ فرمایا کہ ثالث بھی ہوں اور حریف بھی ہوں۔ مجھے حق ہے کہ اپنے عالم کی رہنمائی کروں۔

بہر صُورت میرے اپنے اساتذہ بہت بلند پایہ عالم تھے لیکن حق یہ ہے کہ جو کچھ حضرت رحمتہ اللہ علیہ کے وفورِ علم پر اِعتقاد ہے ابھی تک کسی دُوسرے پر قائم نہیں ہوا۔ خصُوصاً دینی علوم میں۔ اُور پھر اس پر عامل ہونے میں تو آپ یکتائے زمانہ تھے۔ نہ ایسا کوئی عالم میں نے دیکھا۔ اُور نہ ایسا کوئی باعمل دیکھا۔ سراسر علم اور سراسر عمل تھے۔ نور اللہ مرقدہٗ۔

آپ کے مکتوبات آپ کی تصانیف اور آپ کا بہت بڑا کتب خانہ جو اپنی وسعت اور نایاب کتب کی وجہ سے اپنی مثال آپ تھا۔ آپؒ کی علمیت کاملہ اور وافرہ کا بیّن ثبوت ہے اُور وہ عظیم کتب خانہ اَب بھی موجود ہے۔

باب دوم

حضرتِ اقدس رح کے اوصاف

وفورِ حیاء: الحیاءُ شعبۃ من الایمان کے مطابق حیا ایک مسلمان کی مسلمانی کا بہت بڑا نشان ہے اور اس صفت میں وہ ممتازِ اقران تھے۔ یا ایّھا المزّمّل کی صحیح تفسیر و تعبیر تھے۔ کبھی بھی باہر کھلے منہ نہ نکلے بلکہ سر پر ٹوپی ہوئی یا عمامہ دونوں صورتوں میں وہ سرِ مبارک پر چادر رکھتے جس کے کنارے آپ رح کے رخسار مبارک اور آپ رح کی چشم ذی بصارت کے پردہ پوش ہوتے تھے۔ آپ رح دائیں بائیں نہیں دیکھتے تھے۔ صرف سامنے نظر ہوتی تھی۔ اور وہ جب کسی کو مخاطب بنانا چاہتے تھے یا کوئی التجا و تضرّع سے آپ رح کو ملتفت کرنا چاہتا تھا اور آنے جانے چلنے پھرنے میں مجسّم حیا نظر آتے تھے۔ للّہ شریف میں زمانہ قیام طالب علمی، تقریباً کئی سال گذارے۔ للّہ شریف کے ایک چوہدری سے کھانا آتا تھا۔ اور عام قاعدہ کے مطابق، ان کی لڑکی حضرت رح کو کھانا مسجد میں پہنچایا کرتی۔ ایک دن وہ لڑکی بیمار ہو گئی۔ اس کے والد حضرت رح کے پاس آئے اور کہا کہ آپ کی ہمشیرہ بیمار ہو گئی۔ دعا کریں۔ تو آپ رح نے حیرت سے فرمایا کون سی بہن عرض کیا جو آپ کا کھانا لاتی تھی۔ فرمایا میں نے اُسے کبھی نہیں دیکھا نہ معلوم کوئی مرد ہے یا عورت۔

گھروں میں عام خادمائیں عورتیں رہا کرتی تھیں اور شہر کی عورتیں بھی آتی جاتی تھیں۔ حضرت قبلہ نہ تو کسی کی طرف نظر اٹھاتے تھے اور نہ ان سے کوئی بات فرمایا کرتے تھے۔ غرض عورتیں تو عورتیں رہیں، مردوں اور بچوں سے بھی آپ رح کو حیا تھی۔

اصل بات یہ ہے کہ جب الٰہی حیاء کسی پر غالب آجاتی ہے تو پھر اس کے غلبے سے تمام جاندار اور بے جان اشیاء سے حیا آتی ہے۔ ننگے جسم غسل خانے میں نہانا بھی مشکل ہو جاتا ہے بلکہ اپنے وجود سے بھی حیا مانع ہو جاتی ہے اور اپنے جسم کو دیکھنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔

ربانیّین کی صفتِ حیا عام ہے۔

دیکھا جاتا ہے۔ کہ وہ کس درجہ کا حیادار ہے جس درجہ کی حیا اس پر غالب ہو۔ اس

درجہ کا اس کا مشاہدہ ہے، کیونکہ مشاہدہ ہی حیا کا باعث ہوتا ہے۔ جن پر یہ صفتِ مشاہدہ غالب ہوتی ہے وہ پاؤں پھیلا کر بھی نہیں سوتے بلکہ سکڑ کر پڑے رہتے ہیں۔

صوفیائے کرام کی یہ صفتِ ممتاز عام نہیں۔ علمائے کرام کو دیکھئے۔ وُہ باوجود وَاللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ شَہِیْد کی تبلیغ کے اِس صفت میں داخل تک نہیں ہوتے۔ سیدالکل خاتم النبیّن صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو اپنے صحابہ سے بھی حیاء آتی تھی۔

حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ تشریف لائے۔ پاؤں مبارک سکیڑ لئے اور فرمایا: عثمان سے تو اللہ تعالےٰ کو بھی حیاء آتی ہے

غرض جس میں حیاء نہیں، اس میں کمیِ ایمان ہے اور حیا ہی میزانِ ایمان ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم بھی مجسمۂ حیاء تھے۔

کسی موقعہ پر بھی یہ صفتِ مکرم آپ کی ذاتِ بابرکات سے الگ نہیں ہوئی۔ لیکن آج اس صفتِ ممتاز پر علماء بھی پھبتیاں اڑاتے ہیں۔ فرنگی اثر کے غلبہ سے سر تک ننگے بیٹھنے کو عیب خیال نہیں کرتے بلکہ بڑے بڑے جلسوں میں ننگے سر تقاریر اور وعظ فرمائے جاتے ہیں۔ اور سر ڈھانپنے والے صُوفی کو بُرا بھلا کہا جاتا ہے۔ حالانکہ نظر زیر ہونا گناہوں سے بچاتا ہے۔ **یغضوا ابصارھم** کی ایک گونہ تعبیر ہوتی ہے۔

حیا بذاتہٖ گناہوں کا قاطع ہے۔ جس کی طبع میں حیاء ہو وہ اکثر پاکباز ہوتا ہے اور اسی صفت کی وجہ سے یہ صفت ممتاز صفات میں داخل ہے۔

اِستغناء: غِناء اس کا مادہ ہے جس کے معنے بے نیاز ہونا یعنی حاجت مندی نہیں۔ ہر کسی سے بے نیاز۔ ضروریاتِ ذاتی سے بے نیاز۔ اپنی ضروریات سے بے پروا۔ یہ صفتِ کامل، کامل فردِ انسانیت کے لئے نہایت ضروری ہے کیونکہ جو انسان اپنی ذات کی ضرورت میں مبتلا ہوتا ہے۔ وُہ کسی دوُسرے کی ضروریات کی طرف متوجہ تک نہیں ہوتا۔ چہ جائیکہ انسانی معاشرہ کی تکمیل کرے۔ اِقبال مرحوم نے کامل فردِ انسانیت کی تعریف میں چند ابیات لکھے ہیں۔ جو آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔ مرحوم کہاں سے یہ فطرت لایا تھا کہ فطرتِ انسانی کی کامل ترجمانی کرتا ہے۔ اور حقیقتِ انسانی کی موقعہ بموقعہ پوری تصویر کھینچ دیتا ہے۔ کہتا ہے:

خاکی و نوری نہاد ـــــ بندۂ مولیٰ صفات

یعنی کامل انسان گو ظاہراً تو مٹی کا ہے لیکن اس کی اصل نوری ہے۔ یہیں بشریت اور نور کا جھگڑا ختم ہو جاتا ہے جو آج اُمت کے لئے فتنہ بنا ہُوا ہے۔ اور علمائے امت جس کی وجہ سے دست و گریباں نظر آتے ہیں۔ بشر بھی ہے اور نور بھی ہے۔ ظاہراً بشر دکھائی دیتا ہے لیکن باطناً سراسر نور ہے۔ پھر فرماتے ہیں "بندۂ مولیٰ صفات" ہے تو بندہ لیکن صفاتِ الٰہیہ سے سرفراز۔ فرمائیے! کیا رہ گیا؟ دونوں باتیں آگئی ہیں۔ واقعی عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ کی کیا تفسیر انوکھی کی گئی۔ اَللہُ اکبر پھر فرماتے ہیں: ؏

ہر دو جہاں سے غنی اس کا دلِ بے نیاز

یہ زبانی دعویٰ نہیں۔ حقیقتاً آج کا انسان ایک جزوِ زندگی سے بھی بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ جن کو امت کا رہنما خیال کیا جاتا ہے چہ جائیکہ دونوں جہان سے کوئی بے نیاز ہو۔ آج کی انسانیت اپنی ذہنی پستی کی وجہ سے اگلے جہان سے تو بے نیاز ہو چکی ہے۔ کہتے ہیں ہوگا کہ نہیں یعنی اگلا جہان ہے بھی کہ نہیں؟ اس کے لئے عمل تو کیا کریں گے جب اس آخری زندگی پر ایمان ہی نہیں رہا۔ لیکن پھر بھی آج کی دُنیائے اسلام میں یہ مسلمان کہلاتا ہے حالانکہ اسلام اس آخرت پر سب سے پہلے ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے اور یہ دعوت جب تک مکمل نہ ہو، یعنی ایمان بالآخرۃ نہ ہو تو اُس وقت تک قرآنی عقیدہ کے مطابق مسلمان کہلانے کا مستحق نہیں۔

غرض جیسے کہا گیا۔ یہ صفتِ استغنار ہر کامل فرد میں کامل ہوتی ہے۔ نبی کریم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی ذاتِ بابرکات کا مطالعہ فرمایا جائے تو اس صفت کو آپؐ کے اندر کامل درجہ پر دیکھیں گے۔ تمام زندگی میں روٹی پیٹ بھر کر کھانی میسّر نہ ہوئی یا کھائی نہیں۔ کیوں؟ وُہ امت کے مالک تھے۔ ان کے سامنے اُمت کے ضروریات تھے نہ اپنے حوائج و ضروریات پر توجہ تھی۔ نہ اپنے کپڑے کی طرف توجہ تھی نہ رہائش کی طرف۔ مٹی کے ٹوٹے ہوئے حجروں میں تمام زندگی شہنشاہِ ہدایتؐ نے گزار دی۔ اور کبھی مولائے کریم سے اس کی شکایت نہ کی۔ فرمایا گیا: اَے نبیؐ تو چاہے تو میں اُحد کے پہاڑ کو سونا کر دوں۔ لیکن نبی آخرالزماںؐ کو یہ پیشکش پسند آئی اور وہی عزائم بلند سامنے رہے صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم۔ اللہ اکبر یہ ہے انسانیت، جو فخرِ موجودات ہیں۔

Marfat.com

حضرت فاطمہ رضؓ اپنی بیٹی کی تکالیف تنگدستی دیکھتے رہے۔ لیکن ہمیشہ یہی کہا کہ تو جنّت کی مالکہ ہے۔ اِسی پر علامہ اقبالؒ کہتے ہیں: ع

اس کی امیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل

ایسے لوگوں کی امید تو رہتی ہی نہیں جو ذات کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے یعنی خواہش ختم ہو جاتی ہے لیکن مقاصدِ انسانیّت جو بلند سے بلند ہوتے ہیں وُہ ہمیشہ مدِّ نظر ہوتے ہیں۔

پھر ان کی تکمیل کیلئے اللہ تعالیٰ ادائے دِلفریب اور نگاہِ دلنواز عنایت فرما دیتا ہے۔ بلکہ یوں خیال فرمائیے کہ ایسی اِنسانیت کی ادا دِلفریب ہوتی ہے اور نگاہ دِلنواز ہوتی ہے۔ اِنسانیّت عامہ خود اس کی طرف جذب ہو جاتی ہے اور ہر فرد اس سے محبت رکھتا اور اس کے اتباع کی طرف بڑھتا ہے۔ اور انسانیتِ کاملہ کو عروج پہنچتا ہے۔ یہاں تک کہ وُہ دنیا کے لئے ایک رحمتِ الٰہیہ ثابت ہوتا ہے۔ اور دنیا اس کے سایہ میں بیٹھتی ہے۔ کوئی ولی اللہ اس صفت سے خالی نہیں ہوتا۔ اور جس کو یہ صفت دی نہیں جاتی وہ ولی ہی نہیں ہوتا بلکہ ہماری طرح ایک بشر ہوتا ہے گو صالح ہو۔

بہر صورت یہ صفتِ استغناء ہمارے حضرتؒ میں کامل مکمل تھی۔ جب سے پیدا ہوئے اور اس وقت تک جبکہ آپؒ رخصت ہو گئے۔ یہ صفت ان کے اندر مکمل رہی۔ جوانی میں امنگیں ہوتی ہیں تو یہ صفت جاتی رہتی ہے۔ بڑھاپے میں اِنسانی ہمّت گر جاتی ہے تو نیازمندی آ جاتی ہے لیکن جس نے اس مردِ بلند ہمت کو دیکھا۔ وہ جانتا ہے کہ کسی آن بھی ان پر نیازمندی کسی انسان کے لئے نہیں آئی بلکہ یہ نیاز سراسر بارگاہِ عبودیّت کے لئے ہو چکی تھی۔ اُسے اپنا کارساز ظاہری و باطنی خیال کر رکھا تھا۔ توجہ تھی تو اس ذاتِ وحدہٗ لاشریک کی طرف۔

مولانا سوہاویؒ مرحوم فرماتے ہیں: ے

اوہ اک لحظہ جُدا نہ ہوندے رب تھیں

وسدے خاموش حیران اِس سبب تھیں

یعنی ایک گھڑی اللہ تعالیٰ سے جُدا نہ ہوتے۔ اِسی وجہ سے وُہ خاموش، چُپ چاپ اور

---

(۱) حضرت مولانا محبوب عالم سوہاویؒ حضورؒ کے خلیفہ تھے۔

Marfat.com

حیران نظر آتے تھے۔

کیا عرض کروں، یہ حیرانی کس نے دیکھی؟ جس نے دیکھی وہ خود حیران رہ گیا۔ اور اس محویت عالم کی سرکار کا والہ وشیدا ہو گیا۔

کامل کی کاملیت تو یہی ہوتی ہے۔ کہ چہرہ ہدایت کا باعث ہو جاتا ہے اور زبان سے ایک حرف بولنے کی ضرورت نہیں رہتی حضرتِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چہرہ مبارک نے ظلمات کے پردے کیسے چاک کئے تھے۔ سعدیؒ کہتے ہیں: کَشَفَ الدُّجٰی بِجَمَالِہٖ کہ آپؐ کے جمال نے تمام اندھیرا اکفر دُور کر دیا۔

آج منبروں پر بیٹھے، اجلاسوں میں کیا کچھ سنایا نہیں جاتا قرآن پاک، حدیث پاک کے دریا اُلٹ دیئے جاتے ہیں۔ اور خلق اللہ ہے کہ ہمہ تن گوش ہو جاتی ہے لیکن ایک نہیں نکلتا جو ان پر ایمان لائے۔ اور اپنے اندر کوئی انقلاب جذبات پائے۔ کیوں؟ صرف اس لئے کہ آج چہرہ میں ہدایت نظر نہیں آتی۔ اور چہرے کے اندر وہ انوار چمکتے دکھائی نہیں دیتے جن سے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کی آواز اُٹھے اور تمام خواہشات سے دِل سرد ہو بلکہ اب تو دل گرم وہی خیال کیا جاتا ہے، جو دُنیا کی مدہوشی میں سب کچھ بھول گیا۔ ورنہ پہلے اُلٹ تھا کہ دلِ گرم وُہ خیال کیا جاتا جو الٰہ العالمین کی ذات سے گرم ہوتا۔ اللہ اللہ کرتا تھا۔ حضرتِ صدیق اکبرؓ کی یہ دُعا اَللّٰھُمَّ زِدْ حَیْرَتِیْ فِیْكَ کتنی بلند تھی۔ اور حضرت بیربلویؒ کا بار بار" زیرکی بفروش وحیرانی بخر" پڑھنا اندرونی جذبات کی ترجمانی ہی نہ تھی۔ بلکہ دل ونگاہ کی محویت اور استغراق کا کامل نمونہ تھا۔ جس کی وجہ سے چہرہ مبارک ایک حیرت کا آئینہ تھا۔ جو دیکھتا تھا محوِ حیرت رہ جاتا۔ اور یہ عین صدیقیت تھی، جو بہت کم کسی کو نصیب ہوئی۔

ملفوظ: حضرتِ اقدسؒ فرمایا کرتے تھے۔ دونوں طرف نبھاؤ ہو گیا۔ میں جب گھر آیا، تو اللہ تعالیٰ سے عہد باندھا کہ میں تیرے دَر کے سوا کسی کے دَر پر نہ جاؤں گا۔ اور تو مجھے غیر دَر پر رُسوا نہ کرنا۔ نہ میرے اندر کبھی یہ خیال آیا کہ کسی غرض سے کسی کے دَر پہ جاؤں اور نہ ہی اللہ تعالیٰ نے مجھے کسی دَر پر جانے کے لئے دست درازی کا موقع دیا۔ وُہ دیتا رہا اور میں کھاتا رہا۔ حضرتؒ کا اپنے زمانہ میں ایک وسیع لنگر تھا۔ آنے جانے والوں کے سوا درس میں بھی گاہے اسی کے قریب اور گاہے ساٹھ کے قریب طلباءِ دین رہتے تھے۔ ابتداءً آپ مسندِ درس پر ہی تشریف فرما ہوئے۔ اور بعد میں مسندِ ارشاد پر تشریف لائے بہرصورت ہماری

سرکارِ عالی کو غنا کا وُہ درجہ اللہ تعالےٰ نے بخشا تھا جو کسی مجذوب فقیر کو نصیب ہو تو ہو۔ ورنہ ایک سالک کے لیئے یہ مقام بڑا مشکل ہے۔ کیونکہ دنیا میں طلب اور حاجت رُسوائی کے بغیر نہیں۔ اور ہر کہ دمہ حتّیٰ کہ شاہِ وقت اور شہنشاہِ وقت کو بھی گاہ بگاہ نہیں بلکہ اکثر حاجات اور مطالب کے لیئے کسی در پر جُھکنا پڑا۔ اور بعض اوقات رازدارانِ خلوت دیکھتے ہیں کہ عجیب عجیب ابتلا میں یہ بادشاہ مُبتلا ہوتے ہیں۔ گھر میں جُوتے کھاتے ہیں اور باہر شاہی کرتے ہیں۔ انسان اور خدائے قدّوس میں یہی امتیاز ہے کہ وُہ کسی کا محتاج نہیں اور یہ انسان کی احتیاج ہی اس کی زندگی ہے۔

تحمّل: تحمل کے معنی برداشت کے ہیں۔ یعنی بوجھ اٹھانا۔ ایک بوجھ ظاہری ہوتا ہے اور ایک بوجھ باطنی۔ یعنی ذہنی یا قلبی۔ یہ صفت بھی انسانی تکمیل میں اپنا پورا پورا حصہ رکھتی ہے۔ اور جتنا تحمّل کسی انسان میں زیادہ ہوتا ہے اتنا ہی اسے شرف حاصل ہوتا ہے۔

نبوّت جو سراسر شرفِ انسانی ہے وہ اِس صفت سے انتہائی درجہ پر موصوف ہوتی ہے۔ نبی آخر الزمانؐ کا خود ارشاد ہے:

نحن معشر الانبیاء اشد بلاءً (جتنا قرب زیادہ اتنی تکالیف زیادہ)

اور خود قرآن شاہد ہے کہ

وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ الَّذِيٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ۔

(وُہ بوجھ اٹھا نہیں لیا؟ جو آپ کی پیٹھ مبارک کو توڑ رہا تھا)

وُہ کیا تھا؟ تمام عرب کی دشمنی، اقرباء کی دشمنی اور مخالفت، صاحبِ ادیان کی عداوت وحسد۔ "ایک جان اور دکھ ہزار والا معاملہ تھا" لیکن آنحضرتؐ مجسّمۂ تحمّل تھے۔ کبھی نہ گھبرائے ـــــــــ اور کبھی آپؐ نے واویلا نہ کیا۔ جو کُچھ ہے اندر ہے۔ اور منہ پر ایک لفظِ شکایت نہیں آتا۔ بلکہ اس تکلیف سے ایک گونہ راحت ہے کہ یہ تکالیف اللہ تعالےٰ کی دی ہوئی ہیں۔

قرآن حکیم بار بار فرماتا ہے:

وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ۔

ترجمہ (اور تو صبر کر اور تجھ سے صبر ہو سکے اللہ ہی کی مدد سے اور ان پر غم نہ کھا اور تنگ مت ہو ان کے فریب سے)

دوسری جگہ ان الفاظ میں تسکین فرمائی جاتی ہے۔

وَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ وَاھْجُرْھُمْ ھَجْرًا جَمِیْلًا۔

(جو کچھ وہ کہتے ہیں، اس پر صبر کیجئے اور اچھے طریقہ اور سلیقہ سے ان سے الگ ہو جائیے) کہتے کیا تھے؟ ایک نبی کو جادوگر اور دیوانہ۔ خود غور کیا جاوے۔ اس سے بڑھ کر کیا دُکھ تھا کہ ہو تو نبی، لیکن اُسے کہا جاوے جادوگر یا دیوانہ۔ غرض اگر ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی تسکین پئے درپئے نہ ہوتی۔ تو یہ تکالیف کیسے اٹھائی جا سکتی تھیں۔

البتہ صاحبِ ولایت کی تسکین الہاماً، قلباً اور ذہناً کی جاتی ہے۔ ورنہ سچے کو جھوٹا کہنا کون برداشت کر سکتا ہے۔ جبکہ اسے یہ بھی معلوم ہو۔ میرا ربّ میرا مددگار ہے اور میں اس کے حکم سے جو کچھ تبلیغ کر رہا ہوں، کر رہا ہوں۔ ابتدائی ایام نبوت اور ولایت میں تکالیف بہت ہوتی ہیں، اور جوں جوں نبوت یا ولائت بار آور ہونے کے قریب ہوتی جاتی ہے تکالیف خود بخود کم ہوتی جاتی ہیں۔ تاہم ایک لمحہ بھر خالی نہیں رہتا جس کے اندر کوئی احساس تکلیف نہ دے رہا ہو۔ ویسے تو تمام دنیا آج اِس مصیبت میں گرفتار ہے لیکن وُہ خواہشاتِ نفس کی وجہ سے ہے۔ کسی پاک مقصد کے لئے کوئی تکلیف نہیں اٹھا رہا۔ یہ تحمل نہیں کہلاتا بلکہ ایک مغلوبیت ہوتی ہے۔ جس کے اندر کوئی رمقِ حیات نہیں ہوتی۔

غرض حضرتِ اقدس رح کے ابتدائی ایام سے آخری منزل تک کئی تکالیف آئی ہوں گی لیکن مجھے ان کا علم نہیں۔ ہاں وہ تنگدستی تو عمر بھر رہی، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ساتھ مخصوص تھی۔ جسے آپ رح نے خود اللہ تعالیٰ سے مانگ رکھا تھا۔ الفقر فخری۔

اَللّٰھُمَّ اَحْیِنِیْ مِسْکِیْنًا وَّاَمِتْنِیْ مِسْکِیْنًا وَّاحْشُرْنِیْ فِیْ زُمْرَۃِ الْمَسَاکِیْنِ۔ او کما قال۔

(اے اللہ! مجھے مسکینی پر زندہ رکھ اور مسکینی پر مار، اور مسکینوں میں مجھے روزِ آخرت اٹھا)

اِس کے علاوہ آپ رح اکثر بیمار رہتے۔ بواسیر کی وجہ سے ہمیشہ آپ لیٹے رہتے یعنی بڑا تکیہ پشت مبارک کے ساتھ ہوتا اور پاؤں پھیلائے رہتے تھے۔ ہماری دادی صاحبہ فوت ہو

گئی تھیں۔ اور بعد میں پھر مختار لنگر کی ضرورت پر آپؒ نے ایک اور حرم سے نکاح کیا۔ جو طبیعت کے بہت سخت تھے۔ اور دروازۂ مسجد پر موچیوں کی دکان تھی جس پر ہر وقت حقہ نوشی ہونے کے علاوہ تمام بے نماز تھے۔ حتیٰ کہ جمعہ کے عین وقت جب مسجد میں اذان اور خطبہ پڑھا جا رہا ہوتا تھا۔ وہ بدستور اپنے شغل میں کام کر رہے ہوتے تھے اور باتیں بنا رہے ہوتے۔ ایک عام آدمی کو بھی ان کا ایسے مشغول رہنا اور ایک انبوہِ کثیر کو ان کی نماز کی غیر مشغولیت اور وعظ سے متاثر نہ ہونا بُرا ہی معلوم نہیں ہوتا تھا بلکہ قلبی تکلیف محسوس ہوتی تھی۔

لیکن حضرتؒ نے بھی عجب طبیعت پائی تھی۔ ذرا پریشانی عمر بھر اس سے نہیں پائی۔ عام مجلس تو عام مجلس رہی کبھی کسی خاص مجلس میں بھی شکایت نہیں کی کہ یہ لوگ کیسے بدبخت ہیں۔ کہ ایک طرف دین کا آفتاب چمک دمک رہا ہے اور ایک طرف یہ اندھے اندھیر میں بے بصیرت غافل پڑے وقت گزار رہے ہیں۔

جیسے پہلے کہا گیا۔ یہ اس جاذبیت کا اثر تھا۔ جو فطرتاً حضرتِ اقدسؒ کو نصیب ہوئی تھی۔ یہ نسبت۔ کیا عرض کروں کتنی باہمّت اور کتنی بلند ہوتی ہے۔ زمین و آسمان ایک ہو جاویں تو یہ نسبت پہلے سے زیادہ چمکتی ہے اور اُٹھتی ہے۔ اسے پرواہ تک نہیں ہوتی کہ جان جا رہی ہے۔ بلکہ اس جان دینے کو ایک کھیل خیال کیا جاتا ہے۔ منصورؒ سولی پر جا کر گرا نہیں بلکہ اور بلند ہو گیا۔ پستی نہیں آئی بلکہ بلندی کی طرف لٹے قدم اُٹھے۔ آج اس حوصلہ کا مرد ایک بھی نظر نہیں آتا؛ کہ اپنے آئندہ طریقتی سلسلہ کیلئے باعثِ عزت ہو گیا ہو۔

یہی حال بعینہٖ ہمارے حضرتؒ کا تھا۔ جب آخری عمر میں فالج گرا تو آپؒ کی عمر شریف ستر برس کے قریب تھی۔ وجود باوجود کمزور تھا۔ اور تقریباً اڑھائی سال کا عرصۂ دراز اس مصیبت میں گرفتار رہے۔ لیکن کبھی بھی آپؒ کے منہ سے یہ نہ نکلا کہ الٰہ العالمین! مجھے تیری دوستی اور محبت سے یہ کیا انعام ملا؟ غرض زندگی بھر میں کبھی ایک حرف بھی منہ پر شکایت کا نہیں آیا۔ اور ہر حال میں وہی شکر زبان و دل پر رہا۔ قرآن حکیم خود فرماتا ہے:

إِنَّ الْإِنسَانَ خُلِقَ هَلُوعًا ۝ إِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوعًا ۝ وَإِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوعًا ۝ إِلَّا

الْمُصَلِّيْنَ الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلٰوتِهِمْ دَآئِمُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ وَالَّذِيْنَ يُصَدِّقُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ وَالَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ ط

(کچھ شک نہیں کہ انسان کم حوصلہ پیدا ہوا ہے۔ جب اسے تکلیف پہنچتی ہے تو گھبرا اٹھتا ہے اور جب اسے آسائش حاصل ہوتی ہے تو بخیل بن جاتا ہے۔ مگر نماز گذار جو نماز کا التزام رکھتے ہیں، اور بلاناغہ نماز پڑھتے ہیں اور جن کے مال میں حصہ مقرر ہے یعنی مانگنے والے کا اور نہ مانگنے والے کا۔ اور جو روز جزا کو سچ سمجھتے ہیں اور جو اپنے پروردگار کے عذاب سے خوف رکھتے ہیں)

ہمارے حضرتؒ بھی عام انسانیت سے بلند ہو کر زمرہ صالحین میں اس درجہ پر داخل ہو گئے جس کا ذکر قرآن حکیم میں ان الفاظ میں فرمایا گیا۔

دعا مختصر مانگا کرتے تھے حتیٰ کہ یہ بھی معلوم نہ ہوتا تھا کہ آپؒ کچھ منہ سے فرماتے بھی ہیں یا نہیں یعنی یہ اس جاذبیت مطلقہ کا اثر تھا کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ عین مصلحت ہے اور اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ یہ تسلیم و رضا کہ دل پر کوئی اثر نہ آئے بہت مشکل دولت ہے ورنہ ہر سالک اگرچہ وہ تسلیم و رضا کا قائل ہے اور تسلیم و رضا پر چلتا بھی ہے لیکن اس کے دل میں ایک وسوسہ بھی نہ آئے بلکہ خیال اور احساس تک پیدا نہ ہو۔ یہ وہی نسبت ہے جسے بعض اوقات ایسی نسبت یا مجذوبیت کہا جاتا ہے۔ یہ حقیقت آپؒ میں بدرجۂ اتم نہیں بلکہ خوف الٰہی میں ہر وقت لرزاں رہتے تھے اور کبھی بشاشی اور خوشی چہرۂ مبارک پر دکھائی نہیں دیتی تھی اور وَ لَا يَأْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ إِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ ــــــــــ کے مطابق ہر وقت حیران نظر آتے تھے۔ یہ باطنی نسبت و کیفیت اپنی فطرت میں سراسر یقین ہوتی ہے۔ اور اس کا ہر خیال فکر قطعیت کا درجہ رکھتا ہے اور مقادیر الٰہیہ کی گرہیں اور عقدے خود بخود اس کے سامنے کھلتے جاتے ہیں۔ والقدر خیرہ وشرہ من اللہ تعالیٰ کی حقیقت سامنے آکر خیر و شر نظر آتا ہے۔ اور ہر فعل خداوندی خیر سے پُر دکھائی دیتا ہے۔ ایسی صورت میں صاحب نسبت سے خیر و شر کی تمیز اٹھ جاتی ہے اور خیر و شر سے بے تعلق ہو کر ہمرنگی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ نہ نفرت رہتی ہے نہ محبت۔ بلکہ ایک گونہ سراسر محبت ہو جاتا ہے۔ اور حدود الٰہیہ سے لاپرواہ ہو کر چلتا ہے۔ گو ظاہری لباس شریعت قائم ہوتا ہے۔ لیکن باطن اس اختلاف سے پاک ہو جاتا ہے۔

اِتباع: لیکن ہمارے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا مزاج بھی اللہ تعالےٰ نے عجب بنایا تھا۔ باوجود نسبت اویسیہ، شریعت کا اتنا پاس تھا کہ کبھی ظاہری عالم شریعت میں بھی آج تک نظر نہ آیا۔ مستحب تک ترک کرنے کو گناہ خیال فرماتے تھے۔ چال ڈھال، عبادت و ریاضت، خورد و نوش، بیداری و خواب، غرض ہر آن اتباعِ رسالتؐ کا جذبہ اپنی پوری آن بان سے ہر زائر کو نظر آتا تھا۔ یہ اجتماع بہت کم فقراء میں دیکھی گئی۔

محبّت: جواہراتِ انسانی میں سب سے بلند جوہر محبّت ہے۔ یہ صفت بلند درجہ رکھتی ہے۔ اسی ایک صفت سے اِنسان، اِنسان بنتا ہے۔ اور اِنسانی اِرتقاء اور معراجِ انسانیت تک پہنچانے والی صفت بھی یہی صفت ہے۔ یا یہ جوہر ہے۔ ہر انسان کی قیمت اِسی صفت سے زیادہ و اعلیٰ اور ادنیٰ و اسفل پیدا ہوتی ہے۔ بلند سے بلند درجہ پر لے جاتی ہے اور کمی یا مفقود ہونے کی صورت میں سب سے نیچے گرا دیتی ہے اور چارپایہ سے گھٹا دیتی ہے۔ یعنی محبوب الیہ (جس کی محبّت ہوتی ہے) کی قیمت پاتی ہے۔ مثلاً ایک پرندہ کی محبت سے پرندہ کی قیمت ہو جائے گی۔ ایک گھوڑے کی محبت سے گھوڑے کی قیمت ہو جاوے گی۔ اور ایک انسان کی محبّت سے اِنسانیت کا درجہ ملے گا۔ لیکن جیسے یہ زوال پذیر ہیں، ویسے ہی ان کی محبت بھی زوال پذیر ہو گی۔

لیکن جب یہ محبّت لازوال کے ساتھ پیدا ہو جاتی اور اُٹھتی ہے تو محبّت بھی لازوال ہو جاتی ہے۔ اور ہمیشہ قائم رہتی ہے۔

جن انسانوں کو پرندوں اور مویشیوں سے محبّت ہوئی ان کا نام تک نہیں۔ اور جن کی محبت اِنسانوں سے ہوئی اور بلند درجہ پر ہوئی وہ یادگاریں قائم ہو گئیں۔ لیکن بلند ہستیوں کی محبّت اللہ تعالےٰ سے ہو گی ؎

ہرگز نمیرد آنکہ دِلش زندہ شُد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

یعنی صفحۂ عالم پر ان کے نام کندے گئے اور اُن مٹ ہو گئے۔

محبّتِ کاملہ: محبّتِ کاملہ وہ ہوتی ہے، جو مُحب کے رگ و ریشہ میں داخل ہو جائے۔ اور محبوب کے سوا اُسے کچھ نظر نہ آئے۔ اور تمام علائق سے کٹ کر اُسی ایک کا ہو رہے۔ اس کی

Marfat.com

ذات کے ساتھ محبت ہو۔ اس کی صفات کا دلدادہ ہو۔ اور اس کے ارشادات اور احکام پر جان دیتا ہو۔ اس کے متعلقین اور متوسلین سے محبت ہو۔ اس کی رفتار گفتار پر دھیان ہو۔ اس کے گھر اور گھر کی دیواروں سے محبت ہو۔ غرض اس کے وطن کو بھی محبوب کا وطن جانتے ہوئے سجدے کرتا رہے۔ غرض محبوب کی ہر اُس شے سے محبت اسے ہو، جو محبوب کی طرف کسی طرح کی بھی نسبت رکھتی ہو۔ جن لوگوں کو محبت سے واسطہ پڑا ہے، وہ جانتے ہیں کہ محبوب کی گلی کا کتا بھی پیارا لگتا ہے۔ گلی تو گلی رہی ؎

پائے سگ بوسید مجنوں خلق گفتہ این چہ بود!
گفت مجنوں این سگے در کوئے لیلیٰ رفتہ بود

یہ ہے محبت، جسے محبت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ورنہ دنیا کی شدید محبت سے کون خالی ہے لیکن وہ محبت نہیں کہلاتی، غرض کہلاتی ہے۔ جس کی کوئی قیمت دُنیا میں نہیں۔

محبّتِ الٰہیہ: محبتِ الٰہیہ کے بھی کئی مدارج ہیں۔ نبوت و رسالت اور ولایت کے مدارج بھی اس محبت کے ثمرات ہیں۔ سب سے بڑی محبت وہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہر نسبت ہونے والی چیز کے ساتھ محبت ہو جائے۔ یہاں تک کہ زبان نہیں، دل کہنے لگ جائے۔ والقدر خیرہ وشرہ من اللہ تعالےٰ۔ خیر اور شر اللہ کے مقدرات سے ہیں اور شر کو بھی خیر کا درجہ دے دیا جاوے، چہ جائیکہ اس کے رسول، اس کی کلام، اس کے احکام، اس کے قوانین اور اس کے دین کی محبت؛ غرض زندگی ہو اور یہ ہی محبت ہر طرف گھومتی ہوئی نظر آتی ہو۔

ہمارے حضرت اقدسؒ اس محبت کاملہ میں اپنی مثال آپ ہیں، جن کا ثانی موجودہ دور میں مجھے نظر نہیں آتا۔

محبّتِ اللہ: کیا عرض کروں۔ جب میں نے دیکھا تو "ہمہ اوست" پر پہنچ گئے تھے خیر و شر سے گزر چکے تھے۔ اور اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ لَاشَرِیْکَ لَہٗ (میری نماز، میراج، میری زندگی، میری موت، سب کچھ اللہ تعالےٰ کے لئے ہے اور کوئی اس کا شریک نہیں) کے درجہ پر ایک نمونہ ہو چکے تھے۔ آپ کو کسی سے کوئی غرض نہ تھی۔ سعادتی فرماتے ہیں:

اوہ اِک لحظہ جُدا نہ ہووے رَب عقیں
وِسے خاموش، حیران اِس سبب تھیں

آپ تھے اور خدائے قدوس کی ہم نشینی۔

پس از سی سال این معنیٰ محقق شد بخاقانی
کہ یک دم با خدا بودن بہ از ملکِ سلیمانی

صِرف اللہ اللہ کرنے سے، یا صِرف نماز میں مشغول ہونے سے یہ "باخدائیت" نہیں حاصِل ہوتی۔ بلکہ سالوں کی عبادتوں اور ریاضتوں کے بعد یہ "باخدائیت" نصیب ہوتی ہے۔ اور جب یہ کسی سعادتمند کو نصیب ہوتی ہے تو وُہ تختِ سلیمانی کی طرف دیکھتا نہیں بلکہ اس سے بلند اپنے آپ کو پاتا ہے۔ پاتا کیا ہے۔ گرفتارِ محبت اپنی محبت کے سوز و ساز میں غوطے کھا رہا ہوتا ہے۔ وہ ہوتا ہے اور محبوب کی ادائیں اور جلوے۔ ایک جلوہ آیا اور دوسرا گیا۔ غرض شب و روز صفاتِ الٰہیہ اور مقادیرِ الٰہیہ کے انعکاس دل پر پڑ رہے ہوتے ہیں۔ اور ایک فلم کے دیکھنے والے کی طرح مبہوت و حیران نظر آتا ہے۔ اِسی حیرانی کو صدیق اکبرؓ نے مزید طلب فرمایا۔ اور اس کے بارے میں ہمارے حضرتؒ کی زبان پر ہوتا تھا۔

زیرکی بفروش و حیرانی بخر (عقل بیچ دو اور حیرانی خریدلو)

یاد رہے جب کوئی اس درجہ محبت پر اترتا ہے تو آدابِ محبت بھول جاتا ہے اور گاہ گستاخیوں میں آجاتا ہے لیکن ہمارے حضرتِ اقدسؒ اِس سے بھی بلند تھے۔ آپ سے عمر بھر کبھی کوئی گستاخی اور بے ادبی اس راہِ محبت میں نہیں ہوئی۔ ایک ایک حکم ایک ایک ارشادِ رسولؐ کی پاسداری تھی۔ مستحب تک واگزار نہیں ہونے دیا۔ چہ جائیکہ کوئی سُنّت رہ جائے۔

محبّتِ رسولؐ: فخرِ موجودات، نبی آخر الزمان حضرت محمّد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کی محبت اِسی طرح رگ و جان میں مسلط تھی جس طرح اللہ تعالٰے کی محبت آپ کی جان و ایمان تھی؛ آل و ازواج، صحابہ کرامؓ، اسوۂ حسنہ اور اقوال و افعال، غرض آپ کی ہر ایک سے یکساں محبت تھی، عمل سراسر سنّت پر تھا۔ سو ہادیؒ فرماتے ہیں:

محبّت اوہ نبی دی ایسی رکھے
سِوا سنّت دے پانی بھی نہ چکھے!
(یعنی آپ پانی بھی سُنّت کے طریقہ پر پیتے تھے)۔

غرض رفتار، گفتار، نشِست و برخاست، افعال و اقوال، سب میں سنّت کا خیال ہمیشہ دامن گیر رہا اور اسے اپنا عمل بنایا۔

جہاں یہ سنّتِ ظاہرہ آپ کے معمولات پر غالب ہو چکی تھی۔ بعینہٖ اسی طرح نبوّت کے سینۂ پاک کے جذبات بھی آپ کے سینہ مبارک میں اسی طرح بھڑکے رہتے تھے۔ کوئی وقت تجلّی الٰہی سے خالی نہ جاتا تھا۔

آج یہ دولت بہت کم کسی کے نصیب میں دیکھی گئی ہے کہ ظاہر و باطن کی یکتاۓ رسالت کِسی کو نصیب ہوئی ہو۔ اندر اگر رسالت سے بھرپور ہے تو ظاہر کے اندر کتنے رخنے نظر آتے ہیں۔ اور اگر ظاہر اتباعِ رسالت پر کامل ہو تو اندر کا فتور صاف باہر نظر آ رہا ہوتا ہے۔ کوئی ایسا دیکھنے میں نہیں آتا کہ اندر بھی نوُر اور باہر بھی نورُ۔ ہاں بعض ہستیاں گاہ گاہ دنیا میں ایسی بھی سر نکالتی رہتی ہیں لیکن بہت کم۔ ہمارے حضرت پیرؒ ومرشد ایسے ہی تھے۔ اندر بھی نور اور ظاہر بھی نور۔ زبان سیف قاطع اور نگاہ برق انداز۔ کون بچے؟ جو آیا گر گیا۔ سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ۔

اِمتزاج مساویانہ محبّت: نسبت جذب فنائیتِ مطلقہ چاہتی ہے اور نسبتِ سالکیت فنائیتِ رسالت کی طرف رغبت فطرتاً رکھتی ہے۔ یکسانیت کِسی ولی اللہ میں بہت کم ہوتی ہے۔ لیکن ہمارے حضرتِ اقدسؒ جو دونوں نسبتوں سے سرفراز اور مساوی نِسبت رکھتے تھے۔ جیسے وہ فنافِی اللہ تھے ویسے ہی فنا فِی الرّسول تھے۔ ظاہراً سراسر نیابتِ رسالت تھی اور باطناً سراسر خلافتِ الٰہیہ چمکتی تھی۔ کیوں؟ صرف اِس لئے کہ وہ اطاعتِ الٰہی کو اطاعتِ رسول اور اطاعتِ رسول کو اطاعتِ خُدا سمجھتے تھے۔ اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ۔

آج کے دَور میں یہ فتنہ بڑا پیدا ہو گیا ہے اللہ تعالےٰ کو الگ ایک ہستی قرار دیا جاتا

ہے اور رسول ؐ کو الگ۔ ویسے تو الگ الگ ہستیاں ہیں لیکن معناً ایک۔ کیونکہ وہ مختارِ کل نیابت رکھتے ہیں، اور نیابتِ کل فرائضِ کُلّی ادا کرنے کی مجاز ہوتی ہے۔ اور اس کے احکام خودِ ربِ اقدس کے ہوتے ہیں۔ متقدّمین میں یہ بحث بہت کم تھی جو آج چل رہی ہے۔ اس وقت تو یہ بحث چلی بھی تو ایک حقیقت پر چلی اور جذباتِ حقیقیہ پر چلتی رہی لیکن اب حقیقت کسی فریق کے اندر نہیں۔ صرف رسمارسمی عقیدہ اور فرقہ بندی پر چل رہی ہے۔ یہ وہ فتنہ ہے جس نے امت کے اتحاد کی بنیادیں ہلا دیں۔ اور امّت تفرقہ کا شکار ہو رہی ہے۔ ان جیسی بے اعتدالیوں کی خیر نہیں۔ دونوں فریق مشرک و کافر کہتے ہیں۔ لیکن بحمداللہ ہم برزخ کی طرح موجود ہیں اور ایک اعتدالِ حقیقی قائم رکھے ہوئے ہیں اور بَیْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا یَبْغِیٰنِ ۝ کا درجہ رکھتے ہیں۔

کتابُ اللہ: رسولُ اللہ ؐ کے بعد کلام اللہ اور کتاب اللہ کا درجہ ہے۔ ہمارے حضرت اقدس ؒ کو کتاب اللہ سے اتنی بڑی محبت تھی کہ خود بھی بڑی عمر میں قرآنِ پاک کو حفظ فرمایا اور تمام اولاد کو بھی اِس حفظ کلام اللہ پر قربان کر دیا اور ایک دو کے سوا تمام اولاد آپ کی حافظ ہوئی۔ میرے والد بزرگوار اور میرے چھوٹے چچا تو بہت پختہ حافظ تھے۔ سال بھر قرآن شریف نہ دیکھنے پر رمضان شریف میں بِلا تردّد مصلّے پر قرآن شریف سنا سکتے تھے۔ اور قاری کے بہت اچھے سامع رہے۔

آٹھ پوتے تھے۔ تمام پختہ حافظ تھے۔ میرے بڑے بھائی اور مجھ سے چھوٹے دونوں بہت پختہ حافظ تھے۔ رمضان شریف میں کئی جگہ قرآنِ پاک تراویح میں پڑھا جاتا تھا۔ خود حضرت اقدس کی مسجد میں کئی جگہ سُنایا جاتا تھا۔

غالباً میں نے گیارہ سال کی عمر میں قرآنِ پاک حفظ کیا۔ قاعدہ تھا، جو لڑکا حفظ کرے اُسی سال اس کو حضرتِ اقدس ؒ کے مصلّے پر کھڑا کیا جاتا تھا۔ اگرچہ یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے، کہ لڑکوں کی اِقتدار نوافل میں جائز ہے یا نہیں۔ لیکن حضرتِ اقدس ؒ عالمگیری فتویٰ کے مطابق لڑکوں کی اِقتدار نوافل میں جائز سمجھتے تھے۔ بعض علمائے وقت سے اِس مسئلہ پر مباحث بھی ہوئے اور تحریری مقابلے بھی۔ بہرصورت جب میں نے حفظ کیا تو مجھے مصلّے پر کھڑا کر دیا گیا۔

میرے اُستاد مرحوم حافظ پیر بخش صاحب[۱] بہت طاقتور و جوان تھے۔ گو قد متوسط تھا۔ طاقت اور قوت میں اپنی مثال آپ تھے۔ اس زمانہ کی تعلیم صرف ڈنڈا پر تھی۔

رات دن بچوں پر ڈنڈا چلتا تھا۔ ہمیشہ لڑکے از روئے خوفِ اُستاد کے ڈرتے رہتے تھے۔ دن میں ایک موت نہیں تھی۔ کم از کم مجھ جیسے کیلئے چار موتیں تھیں پہلی گھاٹی سبق سنانا، دوسری گھاٹی منزل (دوہرائی سنانا) تیسری گھاٹی نیا جوڑ اور سبق تھی اور پھر شام کو چوتھی گھاٹی سبق کی منزل ایک پارہ سُنانا۔ اُستاد ڈنڈے سے لیس ہوتا۔ ایک حرف کیا "داؤ" کا فرق ہوا تو بلا تحاشا ڈنڈا پڑتا تھا۔ کسی اعضاء کا خیال نہ ہوتا تھا۔ یہ سب کچھ روزانہ ہوتا تھا۔ میرے باپ اللہ تعالیٰ ان کو غریقِ رحمت رکھے وہ دیکھتے ہوتے تھے۔ مار پر مار پڑ رہی ہوتی تھی۔ بڑے نرم مزاج اور نرم دِل تھے۔ لیکن حضرتِ اعلیٰؒ (اپنے والدؒ) کے خوف کی وجہ سے یارائے سخن نہ تھا۔ اور میری مار پر اُف تک نہ کرتے تھے۔

بچپن میں بزرگوں کی قبور کو بڑی اہمیت تھی۔ مَیں اکثر اپنے مشہور بزرگ حضرتِ اعلیٰؒ کے چچا صاحبؒ کی قبر پر اپنی موت کی تمنا کیا کرتا تھا۔ موت بُری معلوم نہ ہوتی تھی لیکن اُستاد کا خوف غالب رہتا تھا۔ اِس سے خلاصی کی تمنا ہر آن رہا کرتی تھی۔

یہ سب کچھ کیوں تھا۔ صرف حضرتِ اعلیٰؒ کی محبتِ حفظِ کتاب اللہ کا جذبۂ پاک تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ دُنیا کے سارے مُسلمان حافظ قرآنِ حکیم ہوں۔

درسِ قرآن: جب میری ہوش آئی اور قرآن شریف حفظ کر رہا تھا۔ اس وقت چار درس باقاعدہ تعلیم دیتے تھے۔ تین تو مسجدِ حضورؒ میں تھے اور ایک آپ کی حویلی میں میرے چچا محمد سعید صاحب کی زیرِ نگرانی چلتا تھا۔ دس سے کم اور تیس سے زیادہ کسی درسِ قرآن میں پڑھنے والے نہ ہوتے تھے۔ عموماً بیربل، کوٹ اور ارد گرد کے مواضع کے ہوتے تھے۔ چند باہر کے طلباء بھی مقیم رہتے تھے۔ حافظ پیر بخش صاحبؒ کے علاوہ پہلا درس میاں شاہ عالم صاحبؒ کا تھا، جو آستانہ عالیہ پر مقیم تھے۔ اور تمام زندگی حضرتؒ کی خدمت میں بسر فرمائی اور بعد میں بھی اسی طرح میرے والد صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے ساتھ گزار دی۔ آپ ناظم الاوقات

---

[۱] سکنہ پنڈی لالہ ضلع گجرات

اور مفتی بھی تھے میرے بڑے بھائی علامہ محمد معصوم صاحبؒ مرحوم نے ان سے حفظِ قرآن کیا تھا۔ نہایت متقی تھے فقہ کی کتب پر کامل نظر تھی۔ اور جزئیاتِ مسائل میں کامل یدِطولیٰ رکھتے تھے۔ بڑے بڑے فضلاء ان کا مقابلہ اس صفت میں نہیں کر سکتے تھے۔ تیسرا درس میرے چچا غلام رسول صاحب کا تھا۔ ہر صورت ہر طرف قرآنِ پاک کی آواز تھی۔ اور مسجد کے در و دیوار قرآنِ پاک کے نور سے پرنظر آتے تھے۔ اور دیکھنے والا حیران ہو جاتا تھا۔

تلاوتِ قرآن: خود حضرتِ اقدس رحمۃ اللہ علیہ کو قرآنِ حکیم پڑھنے کا بھی اشتیاق تھا۔ معمول تھا کہ بعد اذانِ صبح قرآنِ حکیم کے مختلف سُور کو پڑھنا شروع کر دیتے تھے۔ ساتھ وضو کا اہتمام رہتا۔ تقریباً پونا پارہ ختم کرتے تھے۔ تب جا کر سنتِ فجر کے لئے کھڑے ہوتے تھے بعد نمازِ ظہر بھی سوا پارہ قرآن شریف اور تفسیر کے مطالعہ کا التزام تھا۔ جب نمازِ ظہر کی دعا ہو چلتی تھی تو مصلّے پر ہی خادم قرآنِ حکیم بمع تفسیر دونوں جلدیں رحل پر رکھ دیتا تھا۔ خود کھولتے تھے اور خود ہی بند فرماتے تھے۔ تقریباً سوا گھنٹہ آپ کا یہ شغل سرد و گرم موسم میں رہتا تھا۔ اور عموماً ظہر گرم و سرد موسم میں صحنِ مسجد میں ہوتی تھی۔

سماعِ قرآن: جو بھی حافظ حاضر ہوتا، اس کو قرآنِ حکیم سنانے کا ارشاد ہوتا تھا۔ جب آپ بیمار تھے تو حافظ غلام محی الدین بھیروی بہت چھوٹے قد کے بچے تھے۔ ان سے اکثر سورہ دہر سُنا کرتے تھے۔

جمعرات کو عشاء کی نماز کے بعد ہمیشہ معمول سورۂ دہر اور قصیدۂ محمدی سننے اور پڑھانے کا اہتمام ہوتا۔ اور اکثر بڑے چچا صاحب جو نہایت خوش آواز تھے، پڑھا کرتے تھے۔ اور خطبہ بھی یہی حضرت کی جگہ دیا کرتے تھے۔ قد و قامت بلند اور موزوں تھا جب منبر پر چڑھتے تھے، تو نہایت خوبصورتی سے خطبہ ادا فرماتے تھے۔

تراویح میں قرآن سنانا: زندگی بھر معمول رہا کہ رمضان شریف میں قرآن پاک تراویح میں ایک سنا کرتے تھے۔ روزانہ پانچ پاؤ معمول تھا۔ میں نے پہلی بار مسجدِ معلّے کے مصلّے پر بایامِ ماہِ پوہ میں سُنایا۔ پھر ایک سال گزار کر جب آپ علیل ہوئے تو آپ کی جگہ "مسندِ ارشاد" کے مصلّے پر سنایا۔ اس کے بعد جب آپ پر آخری ایام میں فالج گرا تو فالج کی حالت میں دو۔

Marfat.com

رمضان شریف حویلی میں تمام تراویح بدستور میری امامت میں پڑھتے اور قرآن شریف سنتے تھے۔ حافظہ نہایت قوی تھا۔ خود ہی سامع ہوتے تھے۔ سوچئے اور غور سے سوچئے یہ کتنی بلند عزیمت ہے کہ فالج ہو اور خود اُٹھ بیٹھ نہ سکتے ہوں۔ پھر بھی وضو سے ہمیشہ باجماعت نماز ادا فرمائی۔ اور تراویح جیسی سنّت کو اسی حالت بیماری میں بتمامہ ادا فرمایا۔ آج کے فقراء اور علماء میں یہ عزیمت کیسے مل سکتی ہے۔ بات وہی ہے۔ ایک طرف سالک تھے اور ایک طرف مجذوب اپنی عزیمت میں پختہ۔ غرض جب آپ مسندِ اِرشاد پر تشریف لائے تھے تو علاقہ بھر میں ایک حافظ ملنا مشکل تھا۔ لیکن جب آپ کی توجہ درسِ پاک پر ہوئی تو ہر گاؤں میں بیسیوں حافظ ہو گئے۔ اور علاقہ حفاظ سے بھر گیا۔

Marfat.com

باب سوم

حضرت اقدسؒ کے معمولات

سحر: آپ ہمیشہ تین چار بجے صبح سویرے اٹھتے اور خادم باہر منتظر ہوتا تھا۔ آپنے مکان میں اکیلے سویا کرتے تھے۔ اِس لئے جب دروازہ کھٹکتا، خادم حاضر ہوتا۔ آپ باہر تشریف لے جاتے۔ اور حاجت سے فارغ ہوکر دوبارہ حجرہ کے سامنے جب آتے تو خادم کوزہ پیش کردیتا۔ وضو کے لیئے الگ کوزے تھے۔ ایک پیتل کا تھا اور ایک تانبا کا جو قلعی شدہ ہوتا قلعی شدہ تانبے والے کوزہ سے آپ استنجا فرمایا کرتے۔ یہ کوزہ پیتل والے سے کسی قدر بڑا بھی تھا۔ اور جب سے دیکھا یہی دونوں کوزے برابر چلے آتے ہیں۔ غالباً آپ تبدیلی پسند نہ فرماتے تھے۔ استنجا سے فارغ ہوکر آپ اس چوکی پر تشریف لاتے جو وضو کے لیئے خاص طور پر ہمیشہ حجرہ کے دروازے کے شمالی جانب رکھی رہا کرتی۔ پہلے ہاتھ دھوتے اور آفتابہ خادم کے ہاتھ میں ہوتا۔

ہاتھ دھونے سے فراغت کے بعد سیاہ مرچ اور نمک جو ایک ڈبیا میں ہوتا تھا۔ اسے لے کر خالی ڈاڑھوں اور منہ کے اندر انگلی سے آہستہ آہستہ دیر تک ملتے کیونکہ ایک دو کے سوا باقی کوئی دانت نہ تھا۔

فرمایا کرتے تھے کہ جب دانت اکھڑ گئے تو دانتوں کا علاج ہاتھ آیا یعنے سیاہ مرچ اور نمک کا ملنا۔ اس کے بعد وضو شروع فرماتے چہرہ مبارک پر نہایت نرمی کے ساتھ اپنے دونوں ہاتھوں سے پانی ڈالتے پھر دھوتے۔ ملنے کے بعد پھر دوبارہ پانی ڈالتے اور بازوں کی طرف توجہ فرماتے۔

بازو پر پانی بھی اپنے ہاتھ سے بہاتے۔ گاہ گاہ خادم بھی کوزے کے ذریعہ تمام بازو پر پانی ڈالتا۔ پھر مسح تمام سر کا دونوں ہتھیلیوں سے اِس طرح فرماتے کہ سبابہ اُنگلی اور انگوٹھا مسح سے بچ جاتا، تو اس سے کانوں کا مسح فرماتے۔ انگلی سے اندرونِ

Marfat.com

کان کا مسح ہوتا اور انگوٹھا سے بیرونِ کان کا مسح فرماتے۔ اور پشتِ دست سے گردن کا مسح فرماتے۔ پاؤں مبارک بعد میں اپنے ہاتھ سے دھوتے۔ آپ کمزور تھے۔ خادم ہی پانی گرایا کرتا تھا۔ گاہ گاہ خود بھی کوزہ پکڑ لیتے تھے۔ انگلیوں کا خلال فرماتے۔

تلاوتِ قرآن: وضو کے لئے جب چوکی پر تشریف لاتے تو قرآنِ حکیم کی تقریباً ایک ہزار آیت پڑھ لیا کرتے تھے۔ چنانچہ ذیل کی سورتیں سننے میں آئی ہیں۔ مزمل، مدثر، القیامتہ، دہر، مرسلات، نبا، نازعات، طارق، الاعلےٰ، غاشیہ، والفجر، والشمس واللیل والضحیٰ، الم نشرح، والتین، زلزال، قارعۃ تا آخر۔

غرض اذانِ صبح ہوتی اور آپ تکیہ سے ٹیک لگائے یَاحَیُّ یَاقَیُّومُ پڑھ رہے ہوتے، تو اللہ اکبر کے لفظ سنتے ہی پاؤں (جو پھیلائے رکھتے تھے) سکیڑنے شروع کر دیتے تھے۔ اور ساتھ ساتھ کلماتِ آذان دُہراتے جاتے تھے اور جب مؤذن اَشْہَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا الرَّسُوْلُ اللّٰہِ کہتے تو صرف انگوٹھے آنکھوں پر رکھتے۔ انگوٹھے چُوما نہ کرتے تھے، جیسے عام رواج ہے۔ آذان ختم ہونے پر آپ کھڑے ہو جاتے اور دُعا سے جب فارغ ہو لیتے تو قرآنِ حکیم پڑھنا شروع فرما دیتے۔

ایک طرف وضو سے فارغ ہوئے اور تولیا سے اعضاء صاف فرمائے اور جھٹ مصلّٰی پر جو دو گز کے فاصلہ پر ہمیشہ بچھا رہا کرتا، جس پر رات دن ایک قالین سوتی، مصلّٰی کے برابر بچھا رہا کرتا؛ اس پر تشریف لے جاتے اور سنّتِ فجر ادا فرماتے۔ قرأت عام طور پر الم نشرح اور الم ترکیف (الفیل) ہُوا کرتی۔ جونہی آپ نے سلام پھیرا، فوراً تسبیح لئے کھڑے ہو گئے۔ دو تین قدم اُٹھانے کے بعد مسجد میں داخل ہو گئے۔ آپ کی مسند شریف مسجد کے مکان کے شمالی دیوار کے ساتھ ہمیشہ رہی۔

مسجد میں نمازی رُخ بہ قبلہ ہو کر اکثر دو صفوں میں بیٹھے ہوتے اور سنن سے فارغ ہوتے آپ کو دیکھ کر کھڑے ہو جاتے اور اقامت شروع ہو جاتی۔ ابھی تکبیر کہنے والا لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ پر پہنچا نہ ہوتا تو آپ تکبیرِ تحریمہ فرما دیتے۔ جو کوئی خاص بلند آواز سے نہ ہوتی بلکہ معمول سے ذرا زیادہ۔ تھوڑی دیر بعد قرأت شروع فرما دیتے۔ اور قرأت آہستہ ہوتی

لیکن نماز پڑھنے والے تمام ایک ایک حرف سنتے تھے۔

اکثر معمول تھا کہ صبح کی نماز میں طوال المفصل پڑھا کرتے تھے اور متصل میں یہ سورتیں ہم نے سنی ہیں: (۱) الحاقہ، المعارج (۲) مزمل، مدثر (۳) نوح اور القیامتہ (۴) دہر و مرسلت (۵) مرسلت اور نبآء (۶) النازعات اور عبس (۷) الطارق اور الاعلیٰ غاشیہ (۸) الفجر اور البلد

سب سے بڑھ کر دیکھنے کی یہ بات ہے کہ وقت میں کمی بیشی کبھی نہیں ہوئی۔ شروع نماز ہمیشہ اندھیرے اُجالے میں ہوئی سورج نکلنے تک اتنا وقت ہوتا تھا کہ اگر قضا کی ضرورت پڑے تو پہلی صورت کی کھلی نماز ادا ہو سکے۔

صبح کی نماز کے بعد فوری دُعا کا معمول نہ تھا۔ بلکہ آیتہ الکرسی اور سبحان اللّٰہ ۳۳۔ الحمدللّٰہ ۳۳۔ اللّٰہ اکبر ۳۴ بار پڑھنے کے بعد دعا کے لیئے ہاتھ اٹھاتے تھے ہمیشہ دُعا دبی زبان سے کی، جسے کسی نے کبھی نہیں سُنا۔ اور دعا نہایت ہلکی ہوتی تھی اور آخر میں اتنا سنائی دیتا: بِرَحْمَتِکَ یَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْن۔ اِس کے سوا دُعا کا کوئی لفظ سُنائی نہ دیتا۔

دُعا ختم ہوئی اور مولوی شاہ عالم صاحب ناظم الاوقات ختم کی چادر لے کر سامنے دو زانو ہو گئے اور چادر بچھا کر بیٹھ گئے۔ دانے ختم کے یکصد اور دس گنتی کے ہوتے تھے، بچھا دیتے تھے۔ اِتنے میں حضرت تکیہ پسِ پشت لگا کر بیٹھ جاتے۔ گاہ کچھ دانے لے لیتے، گاہ اپنی تسبیح پر ہی کچھ پڑھنا شروع کر دیتے۔ عام دستور یہ تھا کہ دو دو دانے ڈالتے جاتے تھے۔

ختم میں کوئی اپنی مرضی سے آ جائے تو آ جائے۔ ورنہ کسی سالک یا طالبِ علم، یا صاحبزادے سے کوئی پوچھ گچھ نہیں تھی۔ بسا اوقات دیکھا گیا کہ مولوی شاہ عالم صاحب کے سِوا صرف دو تین آدمی ہیں۔ اور پھر حضرت قبلہ کی توجہ خاص ختم کی طرف نہ رہا کرتی جب مولوی صاحب نے ختم آپ کے بِلک کیا تو آپ نے جھٹ ہاتھ دُعا کیلئے اُٹھائے اور چند حروف اور الفاظ ہی ادا فرمائے اور بس کہ اچانک یَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْن کی آواز سنائی دیتی تھی۔

پہلا ختم شریف حضرت مجددؒ علیہ الرحمۃ کا تھا۔ صبح کے وقت یہ ختم پڑھے جاتے: الحمد شریف ۷ بار، درود شریف ۱۰۰ بار، پھر لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ ۵۰۰ مرتبہ۔ ——— لیکن ہر بار سَو الگ الگ ہوتا جس کے بعد بسم اللہ شریف بآوازِ بلند ختم پڑھانے والا پڑھتا جاتا۔ جب نوبت آخری بار کی آتی تو مکمل لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ پڑھا جاتا۔ اس کے بعد پھر درود شریف مذکور یک صد بار اور الحمد شریف ۷ بار۔ مختصر دعا کے بعد دوسرا ختم شروع ہو جاتا۔

(۱) لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحَانَكَ اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ ۱۰۰ بار

(۲) یَاحَیُّ یَاقَیُّوْمُ ۱۰۰ بار

(۳) یَا اَرْحَمَ الرّٰحِمِیْنَ ۱۰۰ بار

(۴) یَاغِیَاثَ الْمُسْتَغِیْثِیْنَ ۱۰۰ بار

(۵) اَلصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلَیْكَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ ۱۰۰ بار

اور درود شریف بالفاظِ ذیل:

(۶) اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعِتْرَتِہٖ بِعَدَدِ کُلِّ مَعْلُوْمٍ لَّكَ ۱۰۰ بار

(۷) یَا وَاسِعَ الْعَطَایَا دَافِعَ الْبَلَایَا ۱۰۰ بار

(۸) حَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ ۱۰۰ بار

(۹) سَلَامٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ الرَّحِیْمِ ۱۰۰ بار

(۱۰) رَبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَاَنْتَ خَیْرُ الرّٰحِمِیْنَ ۱۰۰ بار

(۱۱) درود شریف بصیغہ مذکور یک صد بار

اس کے بعد دعا۔

توجہ: جیسے کہ طریقہ عالیہ نقشبندیہ ہے کہ زیادہ تر تربیت سالک توجہ قلبی سے کی جاتی ہے۔ اور بہت سا وقت سالک کا توجہ پیر میں صرف ہوتا ہے۔ اور پیر کے سامنے سالک دو زانو بیٹھ کر اپنے قلب کی طرف متوجہ رہتا ہے اور ساتھ ہی اپنے قلب کو قلبِ پاکِ مرشد کے سامنے رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ تاکہ پیرِ روشن ضمیر کے انعکاس براہ

راست مُرید کے دِل پر پڑ کر دِل وجسم کو ذاکر بنا دیں۔ اور مراقباتِ الٰہیہ سے سلوک کے منازِل طے ہوں۔

ہمارے حضرت قبلہ رحمتہ اللہ علیہ ذکر میں اِس درجہ منہمک نہ ہوتے تھے۔ صرف طریقہ کی رسم تھی۔ اور بس جو کچھ بھی محویّت تھی۔ اور ہر وقت اِسی محویّت میں غرق رہا کرتے تھے۔ حتیٰ کہ سالک سے سالوں بعد بھی نہ پوچھتے تھے کہ تمہاری کیا حالت ہے' ہاں! یہ ہمارا ایمان ہے کہ وہ دریافت کئے بغیر صرف نظر سے ہر آدمی کا حالِ باطن دیکھ ہی نہیں لیتے تھے، بلکہ خود سامنے عیاں ہوتا تھا۔ باوجود اس کے آپ کچھ زیادہ اِلتفات سالکین اور منسلکین کی طرف نہ فرماتے۔ آپ حال مست تھے' لیکن ہُشیار۔ ذرا سی آہٹِ قلبی سے بھی بیدار تھے۔

توجّہ سے فارغ ہوتے تو چند کلماتِ نصائح یا بعض بزرگوں کے تذکرے بیان فرماتے لیکن وُہ دس پندرہ منٹ سے زیادہ نہیں۔ پھر گرمیاں ہوتیں تو دستار مبارک مصلیٰ سے اٹھا کر ہاتھ میں لئے ہوئے اپنے حجرہ شریف کی طرف تشریف لے جاتے۔ چائے کی خالی پیالی یعنی قہوہ پیا کرتے تھے۔ بعض اوقات نُقل بھی ساتھ ہوتا تھا جو مولوی قمر دین صاحب ہفتہ وار شاہ پور سے لاتے اور ایک ڈبہ میں بند ہوتا تھا۔ مثلاً بالو شاہی اور اس قسم کی شیرینی۔

اِس کے بعد بنگلہ پر (جو بہت چھوٹا اور کتابوں سے اٹا پڑا رہتا) تشریف لے جاتے اور وظائف کا صندوقچہ جو ایک ٹین کا بنا ہوا ہوتا، سامنے ہوتا۔ مصلیٰ پر تشریف فرما کر ایک وظیفہ نکال کر پڑھتے اور دبی زبان سے صرف انگلی کے نشان سے نکلتے جاتے تھے۔ دلائل الخیرات، قرآنِ حکیم اور ایسے چھوٹے چھوٹے وظائف پڑے ہوتے۔ بسا اوقات محبت وعشقِ الٰہی سے لبریز کتب کو ایک آدھ آنکھ دیکھ لیتے۔ مثلاً مثنوی بو علی قلندرؒ، مثنوی مولانا رومؒ، مثنوی نانی دہلوی، اور اِس قسم کی کتب بھی محبت کے لگاؤ پر ملاحظہ فرماتے۔ تقریبًا نَو، ساڑھے نَو بجے موسم کے لحاظ سے فارغ ہو کر باہر تشریف لے جاتے۔

سُبحَانَ اللہ۔ فرشتہ صُورت، سفید لباس میں میانہ روی کے ساتھ سر پر چادر اوڑھے، نظر نیچے، جب تشریف لے جاتے، تو کسی کی مجال نہ ہوتی کہ کوئی سامنے آئے بلکہ دُور سے لوگ ہٹتے جاتے تھے۔ غرض قبرستان تک جو آپ کی مسجد سے تقریباً ڈیڑھ دو فرلانگ ہوگا، آپ یکسُو ہو کر تشریف لے جاتے۔ کبھی بھی اِدھر اُدھر سے مڑ کر نہ دیکھا۔

قبرستان میں جاکر والدین شریف کی خانقاہِ معلیٰ کے دروازہ پر کھڑے کھڑے فاتحہ پڑھتے اور فاتحہ پڑھتے وقت دایاں پاؤں جُوتی مبارک سے نکال لیتے اور جوتی کے اوپر رکھتے ہوئے فاتحہ ادا فرماتے۔

خانقاہ کا مجاور جو بیربل کا باشندہ تھا اور صاحبِ کشف بھی تھا، اتنے میں حاضر ہو جاتا اور کوزہ ساتھ لے لیتا۔ اب اس سے بعض اُمُوراتِ غیبیہ میں باتیں بھی پوچھتے جاتے تھے اور چلتے بھی۔ چنانچہ ایک فرلانگ پر جنگل جھاڑیاں آجاتیں، جو ملکیت کوٹ والوں کی تھی، اس میں پوشیدہ ہو کر حاجت روائی فرماتے اور وہیں ایک سترخانہ کچا استنجا کے لئے بنایا تھا، وہاں طہارت فرماتے اور پھر اسی راستہ خانقاہ پر آکر گاؤں کا رُخ لیتے۔ گاہ اسی راستہ سے اور گاہ دوسرا راستہ بدل دیتے تھے۔ واپسی پر بھی یہی حالت ہوتی۔ کوئی سامنے نہ آتا۔ بچے تک اِس ادب کا خیال رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ آپ مسجد میں داخل ہوتے۔

خادم تیار ہوتا۔ وہ فوراً پانی غسل خانہ میں ڈال دیتا۔ آپ گرمیوں میں غسل فرماتے، لیکن سردیوں میں کبھی غسل اُس وقت نہیں فرمایا۔ بلکہ سحری کا غسل ہی کافی خیال کیا جاتا۔ لیکن ہمیشہ نہیں۔ گاہ گاہ گرمیوں میں اس وقت غُسل نہ فرماتے بلکہ بعض وقت قبل ظہر نہایا کرتے جب گرمی زیادہ ہوتی، نہانے یا وضو سے فارغ ہونے کے بعد چار رکعت نفل ضحٰی ادا فرماتے تھے۔ عموماً اس میں سورۃ والشمس، واللیل، والضحیٰ، الم نشرح پڑھنا معمول تھا۔ فراغت کے بعد حزب البحر پڑھا کرتے تھے۔ اور کچھ یَا حَیُّ یَا قَیُّومُ، دو زانو قبلہ رُخ ہو کر پڑھتے رہتے تھے۔ زاں بعد آپ رُو بہ قطب (شمال) ہو کر تکیہ لگا کر بیٹھ جاتے اور گاہ پاؤں پھیلا کر لیٹے رہتے۔ لیکن تسبیح کے دانے یَا حَیُّ

یَا قَیُّومُ کے ورد کے ساتھ دو دو چلاتے رہتے تھے۔

مسجد کے دیگر معمولات: معمول تھا کہ اس وقت اپنی اولاد سے کوئی نہ کوئی کتب درسی لے کر اپنے سبق کو آپ کے پاس بلند آواز سے دہرلئے تاکہ آپ اندازہ تعلیم کرتے جائیں۔

چنانچہ غلام رسُول صاحب کو بُخاری، جلالین سُناتے میں نے دیکھا۔ اَور میرے بھائی مرحوم محمد معصوم صاحب کو بھی اَور خود اس سیاہ کار نے اپنے بھائی خواجہ فخر الدین صاحب مرحوم اور دیگر کے ساتھ سنایا۔ اَور جب تک آپ صحت میں اور مصلّٰی شریف پر تشریف فرما رہے، یہ معمول ہمیشہ رہا۔ یہاں تک کہ گیارہ ساڑھے گیارہ ہو جاتے تھے۔

یہی وقت سائلین کے لئے تھا۔ کوئی حاجت طلب تعویذ کے لئے یا دُعا کے لئے حاضر ہوتا تو یہی گھنٹہ ان کی حاضری کے لئے مخصوص تھا۔ اِس سے پہلے کسی کی مجال نہ ہوتی کہ حاضر ہو۔ عام طور پر صاحبزادگان صاحبان سے حاجت طلب لوگ تعویذات لے جایا کرتے تھے۔ بعض خواص سے بھی بات چیت اسی وقت ہوتی تھی۔ اکثر مسائل پر گفتگو ہوتی۔ اَور خصوصاً اِختلافی مسائل کو اسی وقت سمجھایا کرتے تھے۔ اور فتوی پر بھی دستخط اِسی وقت ہوتے جو پہلے لکھے ہوئے بعض شاگردوں یا مفتی مقرّرہ یا صاحبزادگان لاتے۔ اگر کسی مسئلہ کے متعلق تردّد ہوتا تو آپ کتبِ متعلقہ کی بابت حُکم فرماتے، کہ رات کو ہمارے بستر کے پاس رکھ دینا۔ آپ رات کو ہمیشہ کتبِ ضرورت کا مطالعہ فرماتے۔ دِن کو بہت کم۔ قرآنِ حکیم کے ساتھ تفسیر کی کتاب کا مطالعہ نہ فرماتے۔ ساڑھے گیارہ بجے کے بعد بالاخانہ پر تشریف لے جاتے۔ خادم کھانا ایک سرپوش لکڑی میں گھر سے لاتا۔ اور چارپائی یا مصلّٰی پر رکھ دیتا۔ کھانے کے وقت بلیوں کا آپ کے پاس آنا معمُول تھا۔ کہ آجایا کرتی تھیں۔ آپ اپنے کھانے سے گاہ گاہ لقمے ڈالتے جاتے اور خود بھی تناول فرماتے رہتے۔ کھانے سے فراغت کے بعد بالاخانہ سے نیچے اُتر آتے۔ اَور اپنی مسند پر فروکش ہو جاتے۔ آپؒ کا سرِ مُبارک دیوارِ مسجد سے تکیہ لئے ہوتا اور پاؤں مبارک شمال کی جانب ہوتے، اَور خادم قدم مبارک کی تلیاں آہستہ آہستہ گھی سے ملتا رہتا تاکہ آپ سو جائیں۔

قیلولہ کچھ زیادہ نہ ہوتا تھا بلکہ نصف یا پون گھنٹہ ہوا کرتا۔ جوں ہی آپ کی آنکھ کھلتی

آپ کے یہ الفاظ سنائی دیتے: اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ ذُنُوْبِیْ بِحُرْمَةِ اِسْمِكَ وَاِسْمِ حَبِیْبِكَ۔

دیکھئے یہ بزرگوار ہیں کہ سونے کو بھی گناہ خیال کرتے ہیں اور غفلت کو بھی۔ اور کتنا بلند عقیدہ ہے کہ بِحُرْمَةِ اِسْمِكَ وَاِسْمِ حَبِیْبِكَ۔ یہاں نام کے واسطے سے بخشش مانگی جاتی ہے۔ لیکن علم والے ذات کے صدقہ بھی بخشش مانگنے کو پسند نہیں کرتے۔ بہر صورت بیداری پر آپ کچھ نہ کچھ پڑھتے رہتے اور گرمیوں میں تو غسل فرماتے اور نفل فی الزوال بھی دو چار رکعت ادا فرماتے۔ بعد میں اپنا وظیفہ یَاحَیُّ یَاقَیُّوْمُ برابر تسبیح پر رولتے رہتے تھے یہاں تک کہ اذان ہوتی۔

اوقات کا بہت بڑا انتظام تھا۔ مولوی شاہ عالم صاحب جو مفتی بھی تھے وہ ناظم الاوقات تھے۔ جو گھڑی پیش کش حضرت نور اللہ مرقدہٗ کے ہوتی، آپ ان کے حوالے کردیتے۔ ان کا حجرہ ہر وقت گھڑیوں سے بھرا رہتا تھا تقریباً دہ عدد گھڑیاں چالو رہتی تھیں اذان کا اہتمام ان کے ذمہ تھا۔ کتبِ فقہ کا مطالعہ جوابِ استفتار کے لئے بھی ان کے ذمہ تھا۔ مرحوم شاہ عالم صاحب تیز نولیس نہ تھے۔ کتب پر نشان لگا دیتے اور حضرت قبلہ کے پیش کردیتے۔ بلکہ بیربل میں بھی ان کا ہی فتویٰ ہوتا تھا۔ بہر صورت آپ کے وقت اذان اور جماعت کا انتظام ایسا تھا کہ نہ کوئی اسے سویرے کا الزام لگاتا تھا اور نہ دیری کا الزام لگاتا گرمیوں میں کوئی گرم نہیں کہتا تھا اور سردیوں میں کوئی سرد نہیں کہتا تھا۔ اور یہی حال تھا ہر نماز کا۔

ایک بار مولوی قمر الدین صاحب مرحوم خلیفہ حضرت مرحوم و مغفور کوٹ پہلوان گئے۔ وہاں کے سردار .... جو غیر مقلد تھے، مولوی صاحب سے کہنے لگے۔ ویسے تو میاں صاحب بیربل والے بہت ہی متقی ہیں، بزرگ ہیں۔ لیکن نماز سُستی سے پڑھتے ہیں۔ مرحوم مولوی صاحب حضرت صاحب کی خدمت میں جب حاضر ہوئے تو عرض کردیا کہ فلاں کس یہ کہتے ہیں۔ آپ نے جواباً فرمایا کہ گھر بار چھوڑ کر مسجد کے کونے میں ڈیرا میں نے نماز کے لئے لگایا اور پھر سُستی بھی کروں تو اس کے کیا معنے۔ بلکہ ہمارے نزدیک یہی وقت مستحب ہے، جس پر ہم نماز ادا کرتے ہیں۔ تمام اوقات میں ایک منٹ بھی ایسا نہیں

تھا کہ کوئی سویرے پڑھی جائے اور کوئی دیر سے۔ برابر متواتر ایک وسطی وقت میں ادا ہوتی تھیں۔ اور یہ اعتدال بہت کم کسی عالم دین یا عارف کو نصیب ہوا۔

حسبِ روش وعادت آپ اذان سنتے ہی اپنے پاؤں پھیلے ہوئے سکیڑنے شروع کر دیتے تھے اور آذان کا جواب سنائی دیتا تھا۔ ایک طرف اذان ختم ہوتی، تو دعائے اذان (اَللّٰھُمَّ رَبَّ ھٰذِہِ الدَّعْوَۃِ التَّآمَّۃِ وَالصَّلٰوۃِ الْقَآئِمَۃِ اٰتِ مُحَمَّدَنِ الْوَسِیْلَۃَ وَالْفَضِیْلَۃَ وَالدَّرَجَۃَ الرَّفِیْعَۃَ وَابْعَثْہُ مَقَامًا مَّحْمُوْدَنِ الَّذِیْ وَعَدْتَّہٗ وَارْزُقْنَا شَفَاعَتَہٗ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ اِنَّکَ لَا تُخْلِفُ الْمِیْعَاد) پڑھا کرتے تھے۔ سبحان اللہ کیا ایمان پرور دعا ہے۔ کیسے مخلصانہ الفاظ ہیں اور پھر جس شوق و محبت سے آپ ادا فرماتے وہی جان اور روح دعا تھا۔ سننے والے پر بھی اثر ہوتا تھا۔

یہ دعا پڑھتے جاتے تھے اور اٹھتے جاتے تھے اور پیشاب و استنجا سے فارغ ہوکر چوکی پر وضو فرمانے لگتے اور اس ترتیب سے آہستہ آہستہ وضو فرماتے تھے کہ ہر عضو کے دھونے میں کامل ترتیب اور کامل اتباعِ سنت کا خیال ہوتا تھا۔ داڑھی مبارک اچھی تھی۔ باوجود پوری کوشش سے پانی پہنچانے کے پھر بھی خلال فرماتے تھے۔ مسح سر کا اتنے خوبصورت اور اتنے اچھے طریقے سے فرماتے تھے کہ ٹوپی مبارک زانو کو پہنا دیتے تھے۔ اور مسح میں کوئی بال خشک نہ رہ جاتا تھا۔ پاؤں کی انگلیوں کو بھی خلال فرماتے تھے۔ حالانکہ آپ کی انگلیاں کشادہ تھیں۔ پاؤں کا انگوٹھا مبارک نہایت نازک اور خوشنما تھا۔ ذرا لمبا و گول۔

وضو سے فارغ ہوتے ہی مصلّٰی پر چار رکعت ادا فرماتے تھے جس میں تعدیل ارکان قابلِ غور ہے اور ہمیشہ یکساں۔ سنن سے فارغ ہوتے ہی حسبِ دستور جب نکلتے تھے صفیں تیار ہوتی تھیں۔ وہ بھی یکساں۔ آگے پیچھے کسی کا قدم نہ ہوتا تھا۔ آپ کو دیکھتے ہی اقامت شروع ہوجاتی تھی۔

نمازِ ظہر بھی وسطی ہوتی تھی۔ اور غالبًا الطارق سورۃ کے برابر سورتیں پڑھی جاتی تھیں۔ اور عصر کا قیام ظہر سے کم ہوتا تھا۔ اور مغرب کا سب سے کم۔ عشاء پھر عصر و ظہر کے

Marfat.com

برابر قیام فرماتے تھے۔ رکوع وسجود میں تسبیحات تین بار ادا فرماتے تھے لیکن کوئی نماز بھی بھاری نہ ہوتی تھی، بلکہ ہلکی پھلکی اور مقتدیوں کی راحت۔ فریضہ کے بعد سنتیں اور نفل مصلے پر ہی ادا فرماتے تھے۔ تسبیحات اور آیۃ الکرسی کے بعد مختصر دعا خاموشی کے الفاظ میں فرماتے۔ایک طرف دعائے خیر ہوتی۔ دوسری طرف خادم قرآن شریف بمعہ تفسیر ڈو جلدوں میں الگ غلافوں میں لاتا اور رحل بچھا کر دونوں جلدیں رکھ دیتا۔ آپ پہلے قرآنِ حکیم تلاوت سوا پارہ فرماتے۔قرآن شریف مترجم بہ ترجمہ شاہ رفیع الدین صاحب فارسی و شاہ عبد القادر صاحب دونوں والا تھا۔اور حنا شدہ تھا۔ جولی ریشمی نہایت خوبصورت تھی۔ پھر اس پر ایک اور غلاف نہایت قیمتی، خوش رنگ چھینٹ کا لپٹا ہوتا تھا اور سلا ہوا غلاف اس کے اوپر ہوتا یعنے قرآنِ حکیم تین کپڑوں میں ملبوس ہوتا۔خود غلافوں کو پسند فرماتے تھے۔ پھر تفسیر کھولتے اور مطالعہ فرماتے۔ روح البیان، روح المعانی، عرائس البیان، غرضیکہ مختلف تفاسیر کا مطالعہ ہوا کرتا تھا۔ اکثر فرمایا کرتے تھے،کسی آیۃ کی جب تفسیر دیکھ لی جاتی ہے تو پھر ساری رات اور دن مستی میں گزرتا ہے۔میرا مطلب لکھنے کا یہ ہے کہ آپ صاحبِ ذوق تھے۔ صرف پڑھنا ہی نہیں جانتے تھے بلکہ اندرونی تپش کے لطف بھی اٹھتے بیٹھتے لیتے تھے۔ اس مطالعۂ قرآن میں کوئی گھنٹہ سوا گھنٹہ صرف ہوتا تھا۔اور جب آپ فارغ ہوتے تو خادم آکر قرآن شریف اور تفسیروں کو خود غلافوں میں ڈالتا اور تسلی سے بند کرتا۔ اور رحل سمیت اٹھا کر حجرہ میں لے جاتا۔

خادمِ قرآن و تفسیر لے کر آگے آگے ہوتا اور آپ پیچھے ہوتے۔گرمیوں میں دستار اپنے ہاتھ مبارک میں ہوتی اور سردیوں میں عمامہ سر پر ہوتا۔

گرمیوں میں نماز صحن مسجد میں ہوتی اور درخت شریں کا سایہ اکثر حصۂ صحن میں اس وقت چھایا ہوتا۔ اور سردیوں میں نماز دالانِ مسجد میں ہوتی، جو مسقف تھا۔ صرف صبح و عشا آخری خانہ مسجد میں ہوا کرتی۔

تلاوت سے فراغت کے بعد جب آپ مسند پر تشریف لے جاتے تو اس وقت صاحبِ حاجت اکا دکا ہو کر حاضر ہوتے۔آپ حسبِ عادت خود کچھ زیادہ باتیں نہ فرماتے بلکہ عام خاموشی ہی رہتی۔سوال اتنا ہی پہلے فرماتے۔کیوں میاں۔حاضر عرض کر

دیتا کہ بیمار ہوں ۔ یا مقدمہ ہے یا کچھ اور لیکن مختصر۔ آپ تعویذ دینے کے سوا کچھ نہ فرماتے گاہ فرما دیتے۔ اللہ فضل فرما دے۔

لیکن ہیبت کا کیا کہنا ۔ ایک شیر تھے ۔ جس کے سامنے ہونا بڑا مشکل کام تھا ۔ دوسری طرف نماز سے فراغت کے بعد طلباء اور اُستاد اپنے اسباق میں شروع ہو جاتے اور الگ الگ جماعتوں میں اپنے اسباق پڑھتے ۔ گاہ گاہ اس وقت میں آپ ایک آدھ سبق بھی سُن لیتے اور طلباء سے کچھ پوچھ بھی لیتے ۔

غرض گرمیوں میں تقریباً ساڑھے تین گھنٹے اور سردیوں میں سوا دو گھنٹہ کا وقت ہوتا ۔ پھر آذان عصر ہوتی ۔ اور بدستور آپ وضو فرماتے ۔ چار رکعت سنت ادا فرماتے اور مصلیٰ اِمامت پر تشریف لے جاتے اور حسبِ دستور سابق آیۃ الکرسی، اور تہلیل و تسبیح کے بعد دُعا فرماتے ۔ تمام نمازی، طلباء، صاحبزادگان باہر چلے جاتے اور مسجد میں ایک متنفس بھی نہ ہوتا، کیونکہ عصر کے بعد مدرسہ کی چھٹی ہو جاتی ۔

اُس وقت مسجد اور حضرت کی حالت دیکھنے کے قابل ہوتی ۔ تمام مسجد ایک حیرت کدہ میں تبدیل ہو جاتی ۔ اس کے ساتھ آپ کے چھوٹے چھوٹے دو تین پوتے آپ کے ایک طرف بیٹھے حدیثیں یاد کر رہے ہوتے ۔ آپ ایک کتاب نزہۃ الناظرین جس میں ایک خلاصہ احادیث کا تھا، پڑھا کرتے تھے ۔ آخری وقت یہ عاجز بھی کئی سال آپ کے اِس درس کا شرف حاصل کرتا رہا ۔ دستور تھا، جب سبق یاد کر کے سناتے تھے، تو پھر فرمایا کرتے، ابھی پڑھو ۔ غرض یہ وقت لمبا کیا جاتا تھا کہ ہم آوارگی نہ کر سکیں ۔ اور رُخصت کے بعد صرف ضروری حاجت روائی کے بعد پھر نماز کے لئے مسجد میں حاضر ہو جاویں ۔

اُس وقت تو میرے عِلم میں نہ تھا کہ کیا حکمت ہمارے اِس تنگ کرنے کی تھی لیکن اب تو یہ حقیقت عیاں ہو چکی ہے کہ یہ بداخلاقی سے بچانے کے لئے ہمیں اپنے ضبط میں رکھا جاتا تھا ۔ کیونکہ عام تو چھٹی ہو چکی ہوتی ۔ ایسی صورت میں بچوں کو ضبط رکھنا کوئی آسان کام نہ تھا ۔ اِس کے عِلاوہ کِسی کی اتنی باریک نظر بھی نہ تھی، جو اتنے گہرے نفسیات کے مطالعہ کا مالک ہو۔

حیرت و مستی کے عالم میں آپ کی نظر مبارک اکثر آسمان پر رہتی اور حیرت کا یہ عالم ہوتا کہ کچھ آپ کے سامنے ذاتِ اقدس اور اس کے عجوبات کے سوا نہ ہوتا۔ انوارِ الٰہیہ آپ کے چہرہ مبارک اور پیشانی پر آتے جاتے۔ اور مظہرِ ذاتِ جلال نظر آتے۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ مسجد کے اندر کوئی داخل ہو سکے۔ تا ایں کہ غروب شروع ہوا آپ وضو مغرب کے لئے اُٹھ کھڑے ہوتے اور اپنی مسند کی طرف تشریف لے جاتے۔ پھر حسبِ دستور باترتیب وضو فرماتے۔ پاؤں مبارک دھو ہی رہے ہوتے کہ اذان شروع ہو جاتی۔ آپ اپنی مسند پر پہنچ کر دستار شریف باندھتے۔ معمول تھا کہ دستار مبارک ۱۵ - ۱۶ گز سے زیادہ ہوتی۔ بعض وقت ململ کا تھان ہی سر پر لپیٹ دیتے تھے۔ دستار بندی میں کوئی خاص طرز نہ تھا۔ صرف لپیٹنا مقصود ہوتا تھا۔ اور جس طرح بل آتے جاتے، دیتے جاتے تھے بعض دفعہ خادم پگڑی کو کھولتا جاتا تھا اور پھر صاف کر کے دیتا جاتا تھا۔

مغرب کی نماز کی قرأت قصار مفصل سے ہوتی۔ عام طور پر التکاثر۔ القارعۃ العصر۔ اور آخری دس سورتیں ہوا کرتیں، اور جوڑا جوڑا۔ مثلاً الفیل و قریش۔ اور کافرون و نصر و سورۂ لہب۔ الغرض تمام فرائض سے شام کے فریضہ کی مختصر سورتیں اور قرأت ہوا کرتی تھی۔

نماز کی فراغت کے بعد ختم خواجگان : الحمد شریف ۷ بار، درود شریف، یک صد بار، قل شریف ایک ہزار بار۔ الحمد شریف ۷ بار۔ درود شریف یک صد بار، وہی جو عام معمول خاندان کا ہے۔ ختم کی فراغت کے بعد توجہ فرماتے۔ پھر قدرے نصائح وادکا، فرما کر کھانے کے لئے تشریف لے جاتے۔ اور قریباً ایک گھنٹہ اس میں گزر جاتا۔

کھانے کے لئے اوپر باہر بنگلہ کے سامنے چارپائی بچھی ہوتی۔ اس پر کھانا تناول فرماتے۔ غذا بہت قلیل کھاتے اور ایک سالن ہوتا۔ اگرچہ آپ کی ہنڈیا الگ پکتی، لیکن سادہ ہوتی، نہ گھی کی زیادتی ہوتی، نہ مرچ مصالحہ کی کوئی خاص توجہ ہوتی۔ اکثر آملہ کا شوربا استعمال فرماتے۔ گاہ گاہ گوشت بھی ہوتا۔ لیکن خاص اہتمام گوشت کے لئے کبھی نہیں ہوا تھا کبھی

Marfat.com

زیادہ نہ ہوتا۔ روٹی زیادہ تر توے کی ہوتی، یعنے چپاتی۔ پانی درمیان میں پیا کرتے۔ اور اکثر بہاولپوری کٹورے میں پیا جاتا، جو اکثر بطور نذر پیش ہوتے تھے۔

کھانے کے بعد چارپائی پر آپ دراز ہو جاتے۔ میاں چراغ دین وغیرہ اس کے ساتھی .... تلیاں ملنے لگ جاتے تھے۔ اتنے میں آذان .... ہوتی۔ جب کہ لنگر سے میاں احمد بخش لانگری فارغ ہو جاتے۔ آپ حسبِ دستورِ سابق دُعا کے بعد کھڑے ہو جاتے اور وضو کو شروع ہو جاتے اور چار رکعت سنت ادا کرنے کے بعد امامت کے لئے تشریف لے جاتے تھے۔ بعد فراغت نماز و دُعا۔ آپ گاہ گاہ تمام طلباؔ اور صاحبزادگان اور ان کے لڑکوں کی حاضری چیک فرماتے، کہ کون کون جماعت کے ساتھ شامل نہیں ہوا۔ اور الگ ایک جرمانہ بھی تھا۔ اور اس کے لئے ایک وقت کا کھانا بند۔ صاحبزادگان کا جرمانہ چار آنے جو اس وقت کے لئے بہت بھاری تھا۔ آپ کے پوتوں کا جرمانہ چار چھاڑو پلچھی کے مقرر تھے۔

آپ کی طبیعت بڑی چوکنّی تھی اور ہر چیز پر نظر رہا کرتی تھی۔ آٹھ پہر میں کوئی وقت ایسے نہ ہوتا جس کے اندر آپ کی توجہ کی نکر کسی کو نہ ہو۔ بلکہ ہر آدمی خیال کرتا تھا کہ آپ میرے سر پر کھڑے ہیں۔

مغرب و عشاء کی نماز کے بعد آپ درود شریف بالفاظِ ذیل پڑھا کرتے تھے:

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعِتْرَتِہٖ بِعَدَدِ کُلِّ مَعْلُوْمٍ لَّکَ ۔ اور ساتھ ہی خادم سرمچی سے سرمہ لگا کر پیش کرتا رہتا۔ حساب نہ تھا۔ جب خیال آیا، بند کر دیا۔ اور ساتھ ہی بعض احوالِ بزرگان آپ بیان فرماتے رہتے تھے۔ اور مخصوص خدّام سُن رہے ہوتے۔ درود شریف تین صدؔ بار پڑھنا معمول تھا۔ اور زیتون کی تسبیح یک صد دانہ والی پر پڑھتے تھے۔ فراغت کے بعد گرمی میں بالاخانہ پر تشریف لے جاتے۔ جہاں استراحت کے لئے چارپائی پر بستر بچھا ہوتا۔ اور سردیوں میں مسجد کے ساتھ ملحق کمرے میں بستر شریف کبھی چارپائی اور کبھی زمین پر ہوتا۔ چراغ مٹی کا ہوتا جو ملک میں عام رواج ہے۔ اور اس کے اندر تارا میرا کا تیل جلتا ہے۔ مٹی کے تیل جلانے کا معمول نہ تھا۔ اِس لئے

کہ بُودار ہوتا ہے۔ اَلبتّہ درس میں مٹی کے تیل جلانے کا معمول تھا۔ کیونکہ اس وقت بہت سَستا، دو روپے فی کنستر قیمت تھی۔

بعض وقت مسائلِ ضروریہ جن کا حل فیصلہ درس سے نہ ہوتا، یا اِختلافی مسائل کو دیکھنا ہوتا تو مفتی شاہ عالم صاحب کو اِرشاد ہوتا تھا کہ وہ ان سے متعلقہ کتابیں سرہانے رکھ جائیں۔ اَور چراغ بھی تیل سے بھر کر رکھ جائیں۔ آپ رات کو مطالعہ فرمانے کے بعد جواب بعض وقت لِکھ دیتے اَور بعض وقت صُبح لِکھوائے جاتے۔

باب چہارم

دینُ اللہ

توحیدی تخم سے رسالت کی شاخ پھوٹتی ہے، تو شجرِ توحید سے "اِنِّیۡ اَنَا اللہُ" کی آواز پتا پتا سے نکلنی شروع ہوتی ہے۔ اِس آوازِ خداوندی سے دُنیائے عالم کے سعادت مندِ ازلی متاثر ہوتے ہیں۔ اور یہ تاثیر آخرِ کار عقیدت کی شکل اختیار کر کے ایک مکمل عقیدہ ہو جاتا ہے۔

اور پھر جب عقائد پختہ ہو جاتے ہیں تو افکار و اعمال اس میں ڈھلنا شروع ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایک ایک فعل، ایک ایک خیال اِس عقیدۂ توحید کے اندر چلا آتا ہے، اور تمام اِنفرادیت ختم ہو کر ایک اجتماعیت پیدا ہو جاتی ہے جس کے سر پر صرف ایک گرہ "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ" کی ہوتی ہے۔ اور تمام معتقدات اور فروعاتِ معاشرہ اس کے زیرِ چلنے شروع ہو جاتے ہیں۔ اور یہ وحدتِ اجتماعیہ ایک اُمّت کہلاتی ہے اِسے لفظِ دین سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور خالق ارض و سماء نے اِس وحدتِ اجتماعیہ کو اِسلام فرمایا۔

قرآنِ حکیم میں آتا ہے: هُوَ الَّذِيٓ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰى وَدِيۡنِ الۡحَقِّ۔
اللہ تعالےٰ کی ذاتِ بابرکات نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین دے کر بھیجا۔

عوام میں غلطی ہے کہ ہدایت اور دین کو ایک سمجھتے ہیں، حالانکہ یہ دو چیزیں الگ الگ ہیں۔

ہدایت وہ ہے جو ابتدائے رسالت سے انوار کی شکل میں ظہور پذیر ہوتی ہے جس سے دِل متاثر ہوتے ہیں۔ اور اسلام میں داخل ہوتے ہیں۔ یعنی "اقرارِ رسالت و توحید" کرتے ہیں۔ اور دین وہ ہے کہ جب ایک انسان اِس روشنیٔ ہدایت سے متاثر ہو کر حلقۂ امّت میں داخِل ہو جاتا ہے۔ تو اُمّت کے اِجتماعیہ اور اِنفرادیہ

یہ عزیز بزرگ جب فارغ ہو کر گھر آئے، پنجاب میں اپنی مثل آپ تھے لیکن زمانہ کی نظرِ بد اثر کر گئی۔ اور جوانی کے عالم میں دِق کے مرض سے سال بھر بیماری کے بعد وفات پا گئے۔ اِس حادثہ نے بیربل شریف کے علمی درس کو بڑا نقصان پہنچایا۔ کہ کوئی دوسرا اِس مسندِ درس کے قابل پھر ہمارے خاندان میں پیدا نہ ہوا۔ یہ سپوت اپنے جدِّ امجد کی طرح، اپنے حافظ، اپنے علم میں یکتائے روزگار تھے اور بہت سی امّیدیں ان سے وابستہ تھیں۔ ۱۳۱۲ھ میں بعمر ۲۸ - ۳۰ سال وفات پائی۔ اَللّٰھُمَّ ارْحَمْہُ وَاغْفِرْہُ۔

چارپائیاں: طلباء کے لئے چند منجے (چارپائیاں) تھے۔ جن پر بعض طلباء سوتے تھے، اور وہ بھی رات کو۔ عام طلباء کا بستر فرش زمین ہوتا تھا۔ اور سردیوں میں، دو بہت بڑی دریاں تھیں۔ اور دو لحاف بہت لمبے چوڑے۔ جن میں تقریباً دس پندرہ آدمی بیک وقت سو سکتے تھے، مسجد کے درمیان میں بچھائے جاتے تھے۔ درویش جن کے الگ بستر نہ ہوتے تھے، اس کے اندر سو جاتے تھے۔

کتب خانہ: درس کے لئے کتب خانہ کی بڑی ضرورت ہوتی ہے۔ اور مطالعہ کیلئے بھی کتبِ متداولہ سے الگ ایک ضخیم کتب خانہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن حضرت اقدسؒ کا جو پیسہ لنگر سے بچا۔ وہ سیدھا لاہور اور بمبئی کتب کی خریداری کے لئے پہنچتا تھا۔ حضرت کے نمائندے ہر دو شہر میں متوسلین سے رہا کرتے تھے۔ جو ہر کتاب شائع، کی اطلاع دیا کرتے تھے۔ اور آپ بذریعہ ریل، اگر پلندا زیادہ ہوتا، ورنہ ڈاک کے ذریعہ منگوایا کرتے۔ بسا اوقات خود بھی سرہند شریف آتے جاتے۔ لاہور میں تین تین دن قیام فرمایا کرتے۔ اور کتب خانہ تجارتی شیخ جلال الدین وغیرہ وغیرہ سے کتب منگوا کر شاہی مسجد میں دیکھتے رہتے تھے تاکہ پسندیدہ خرید کی جاویں۔ بسا اوقات یکدم تین تین سو کی خریداری ہو جاتی تھی۔ اور خچر پر کتابیں گھر پہنچتی تھیں۔ غرض جو کچھ ملتا تھا، کتب کی نذر ہو جاتا تھا۔ یہ نہیں کہ صرف دینی کتب خرید کی جاویں۔ معقول کی کتب بھی خرید فرماتے۔ اور طب وغیرہ کی بھی۔ صرف مثنوی کے نسخے کتب خانہ میں پندرہ سولہ

کے لگ بھگ الگ الگ مطبوعہ تھے۔ ایک ترجمہ عربی بھی موجود ہے۔

تفاسیر کا ایک انبار تھا۔ ہر تفسیر جو ملک میں موجود تھی، منگوائی اور مطالعہ

کی۔ اور مطالعہ کے بعد اکثر کتب پر یہ شعر لکھ دیا کرتے تھے: ؎

جمادے چند دادیم ، جاں خریدیم

بحمد اللہ عجب ارزاں خریدیم

طلباءِ درس کا امتیازی درجہ: شب و روز کی نگرانی اور آپ کی نظرِ شفقت سے جو طلباء یہاں تعلیم چند برس تک حاصل کرتے، ان کے اخلاق و کردار کی ضمانت ہو جاتی۔ اور عوام و خواص میں ثقہ خیال کیے جاتے۔ آپ کے طلباءؑ فارغ ہونے کے بعد جہاں کہیں بھی جا کر مقیم ہوئے، عزتِ علم و حلم پائی، اور استقلال کے ایک کوہ پیکر رہے۔

کیونکہ خدمتِ خلق کا سبق روزِ اول سے دیا جاتا تھا، موجودہ زمانے کی طرح نہ تھا۔ کہ ڈاکٹر ہو کر دنیا لوٹی جاوے گی، وکیل ہو کر ساری دنیا میرے پاس آ جائے گی۔ پولیس میں جا کر ہاتھ رنگ لوں گا۔ غرض یہ کسی کے ذہن میں بھی نہ آتا تھا۔ کہ دنیا کے لئے میں پڑھ رہا ہوں۔ بلکہ دینی خدمت کا جذبہ ہوتا تھا۔ اور زندگی بھر معمولی گذران پر وہ لوگ مطمئن رہے۔ اور کسی سے ملازمت کا ایک لفظ سننے نہ پایا۔ تعلیم سے بڑھ کر تربیتِ دینی کا خیال یہاں ہوتا تھا۔ بعض طلباءؑ جو خود بخود حضرتؒ کے لنگر کی خدمت کی طرف متوجہ ہو گئے۔ آٹا پسوانا، چارہ لانا وغیرہ اپنے فرائض میں داخل کر لیا۔ اگرچہ وہ کچھ زیادہ نہ پڑھ سکے۔ کیونکہ ان کی توجہ فطرتاً اس طرف نہ تھی۔ لیکن جب گھر کیلئے رخصت ہوئے تو وہ بھی دوسرے افاضل کی طرح مولوی کہلائے۔

ایک مثال: مولوی خوشی محمد سکنہ ٹھٹی میکن، تحصیل پھالیہ نہایت خوبصورت۔ خوش مذاق جوان تھے۔ اور لنگر کے مال مویشی کی خدمت میں چلے گئے۔ اکثر لنگر کا آٹا پسوانے کی خدمت میں مصروف رہا کرتے تھے۔ ابتدائی ایام اپنے بھینسے خراس کے لئے نہ تھے۔ وہ بھینسے لے کر ہفتہ میں دو بار آٹا پسوایا کرتے تھے۔ اس وقت آٹا پیسنے کی مشین بھی ذہن میں نہ آتا تھا۔

ایک دِن کا واقعہ ہے کہ جوڑی خراس کے لیئے نہ مِلی۔ وُہ اللہ کا بندہ ایک گھر جس میں چکی لگی ہوئی تھی۔ کئی ٹوکروں میں دانے بھر کر رکھ آیا۔ گھر والے کو کہا، کُنڈی نہ لگانا۔ میں رات کو کِسی وقت خراس پر یہ دانے لے جاؤں گا۔ اُور خود عِشاء کی نماز ادا کرنے کے بعد خاموش چکی پر چلے گئے۔ اور رات بھر چکی چلاتے رہے اور صبح ہونے سے پہلے گھر چلے گئے۔ جب صبح ہوئی تو گھر والی نے آٹا دیکھا تو حیران رہ گئی۔ کہ خوشی محمد کِس وقت گھر سے خراس پر لے گیا۔ اور کس وقت واپس اسی جگہ رکھ گیا۔ لیکن مولوی خوشی محمد صاحب سے جُب پوچھا گیا۔ تو کہا، جوڑی تو مِلی نہ تھی۔ اُور گھر میں آٹا نہ تھا۔ اِس لئے میں نے خود ہی آٹا پیس دیا۔

ہاں! جَب کئی سال گذر گئے اور ساتھی دستار بندی سے واپس گھر جانے لگے اور خوشی محمد کا مطالبہ بھی گھر جانے کا ہوا، تو خوشی محمد نے عرض کیا۔ حضور! وُہ دوست عِلم لے کر گھر گئے اور مَیں گھر جا کر کیا دکھاؤں کہ کیا کرتا رہا۔

آپ کو جوش آگیا۔ اور ایک دستار منگائی اور سر پر باندھ کر فرمایا۔ جو ان کو مولوی کہے گا، وہ تم کو بھی مولوی کہے گا۔ جیسے وُہ مولوی، ویسے تم بھی مولوی بفضلِ خُدا آپ نے نہ تو اِمامت کرائی۔ اور نہ ہی شغلِ عِلم رکھا۔ اپنی زمینداری میں عمر بسر کی۔ لیکن ان کو خوشی محمد کسی نے نہ کہا۔ دوست دشمن مولوی خوشی محمد کہتے تھے۔ بڑے ثقہ تھے ویسے بھی عام آدمی ان کو مولوی ہی خیال کرتے تھے۔ اُور مسائل پوچھنے پر فِی الفور بتا دیا کرتے۔

غرض جَیسے اب مشہور یونیورسٹیوں کے طلباء کو دہلی یونیورسٹی، آکسفورڈ کلکتہ، مَدراس اُور پنجاب کا فخر ہے۔ اَیسے ہی اس زمانے میں بیربل شریف کے درس کا ایک امتیازِ خاص تھا۔ خصوصًا تربیتِ دین میں پختہ کار خیال کئے جاتے تھے۔ اقبال مرحوم کے شعر کا مصداق وہ لوگ تھے ؎

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سِکھائے کِس نے اسماعیلؑ کو آدابِ فرزندی

تمام طلباءؑ پر فیضِ نظر کی ایک لہر نظر آتی تھی۔ اُور شکل وصورت امتیازی

ہوتی تھی۔ اعمال و اذکار، اخلاق و عقائد میں پختہ کاری تھی۔ جو آج کسی جگہ کے مکتب میں نظر نہیں آتی۔

دُوسری مثال: میاں کرم دین صاحب بچپن میں آئے اور آپ کی خدمتِ خاصہ میں ہو گئے تھے۔ عمر بہت چھوٹی تھی۔ حتیٰ کہ ان کا ختنہ بھی یہاں ہوا۔ چند سالوں کے بعد جب گھر گئے، تو باپ نے کہا، کچھ سُناؤ۔ سناتے کیا، پڑھا تو کچھ نہ تھا۔ واپس آئے اور حضرت کی خدمت میں تمام قصہ سنایا اور اپنی شرمندگی عرض کی۔ فرمایا! ہاں۔ یعنی خبر میں آپ آگئے۔

دُوسرے دِن آپ نے فرمایا۔ سورۃ دھر یاد کرو۔ چنانچہ چند دن کے بعد یاد کرکے آئے اور سنائی۔ آپ نے اپنی دستار ان کے سر پر رکھی اور فرمایا۔ جاؤ۔ چنانچہ وُہ واپس جب گئے تو عام مولوی سے بڑھ کر قدر پا گئے۔ ہر موقع پر ان کی حاضری کی طلب عوام و خواص میں پیدا ہو گئی۔ اور اَب لکھی پڑھی دُنیا میں شمار ہوتے ہیں۔ صحابہ کرامؓ کا یہی حال تھا۔ کیا پڑھا تھا؟ کیا لکھا تھا؟ رسالتمآبؐ کی نظر نے تمام علوم ان کے سینہ میں بھر دیئے اور جہانداری اور جہانبانی کے اصول و فروع تک حادی ہو گئے۔ اور یاس کے سرچشمہ ہو گئے۔

غرض جو بھی چند دِن آپ کے درس تدریس میں رہا، وُہ ایک خاص صورت ثقاۃ لے کر واپس ہوا۔ اور خاص ذوقِ عِلم و محبت ساتھ لے گیا اور عمر بھر صراطِ مستقیم پر چلتا رہا۔

اِحترامِ دین: ترویجِ علومِ اسلامیہ کے بعد تحریمِ دین پر نظر اٹھائی جاوے۔ عالم عِلم پڑھاتے ہیں اور عِلم میں ہمہ تن محو ہو جاتے ہیں۔ یعنی بذاتہٖ عِلم ہو جاتے ہیں۔ لیکن اکثر دیکھا ہے کہ تحریم (عزّت) دِین کی پروا نہیں ہوتی۔ کوئی کچھ کہے، پروا نہیں۔ جہاں ہمارے حضرت اقدسؒ کے پاس دِین کا جذبہ بہت بلند تھا۔ کبھی بھی دین کے اِستخفاف پر ایک لفظ بھی سُننا نہیں چاہتے تھے۔ اگر کِسی کے منہ سے بے تکے الفاظ بھی اِس بارے نکل جاتے تو مواخذہ ہوتا تھا۔

مولوی شاہ عالمؒ صاحب، جِن کا ذکر کیا گیا، وُہ اس بارے میں اور بھی سخت تھے اور محاسبِ درگاہ بھی تھے۔ ایک بار جمعہ ادا ہو رہا تھا۔ اور التحیات پر جماعت تھی۔ جہلاء سے ایک کمہار آیا۔ مسجد میں جماعت جب التحیات پر بیٹھی دیکھی

توبے اختیار اس کے منہ سے نکل گیا۔ شاید ٹنگ (پوچھلی) یعنی ٹانگ یا دُم مل جائے۔ چونکہ ذرا بلند آواز سے کہا تھا۔ فوراً میاں صاحب کے احتساب میں آگیا۔ نماز کے بعد فوراً بھانڈا (برتن) الگ یعنی عدمِ تعاون کا حکم ہو گیا۔ بیچارے کو جب معلوم ہوا تو توبہ پر آیا، اور ڈنڈ (جرمانہ) ادا کیا۔ از سرِ نو باقاعدہ کلمات دخولِ اسلام پڑھائے گئے۔

حتیٰ کہ میلے پر بھی گرفت ہوتی تھی۔ شاہ پور کا میلہ شاہ شمس، علاقہ بھر میں مشہور تھا۔ دیہاتیوں کا یہ میلہ خرافات کا مجموعہ ہوتا ہے۔ اور ہر علاقہ کا آدمی، بوڑھا ہو کہ جوان، حتیٰ کہ بچے تک جاتے ہیں۔ سال بھر اس میلہ کا اشتیاق رہتا ہے۔ اس زمانۂ جہالت میں اس کی بڑی دھوم ہوتی تھی۔ شہر کم تھے۔ تماشوں کا سلسلہ نہ تھا۔ صرف میلہ ہی میلہ تھا۔ لیکن جب کبھی میلا پر کوئی گیا، ہمیشہ جرمانہ ہوتا تھا۔ اور ادائیگی کے بعد کلمات پڑھائے جاتے تھے۔ غرض دین کا ایک خوف سر پر ہوتا، کہ دینِ الٰہی کے برخلاف ہونے پر سلوک ناروا ہوگا۔ اسی طرح بعض اوقات، عوام کی جیسے عادت ہے، دین کی سُبکی کے لئے کچھ نہ کچھ بک دیتے ہیں۔ لیکن یہاں اوّل تو ہر ایک کے ذہن میں احتساب کا خوف ہوتا تھا۔ لیکن اگر کسی کے منہ سے کچھ نکلتا، تو میاں صاحب کے احتساب میں آجاتا اور توبہ کے بغیر کبھی چھٹکارا نہ ہوتا۔

ترویج درس اور تبلیغ: عام معمول تھا کہ جمعرات کو مسجد کی چھت پر قبل عشا، عورتیں اکثر جمع ہو جاتیں اور حضرت مسجد کے مشرقی جانب سے ایک دریچہ کے ذریعے مصلّے پر تشریف لے جاتے۔ اور بعد توجہ، جو معمولِ حضراتِ نقشبندیہ ہے، چند کلماتِ وعظ بھی فرماتے تھے۔ اور پھر اُلٹے پاؤں حضرت مسجد کی طرف اُتر آتے۔ اور عورتیں پسِ پشت مسجد سے اپنے گھروں میں چلی جاتیں۔

حضرت اقدسؒ کا گھر مسجد کے پُشت کے ساتھ متصل تھا، یعنی مسجد کا محراب آپ کے گھر کے دالان میں تھا۔

ہر جمعہ کو بعد نمازِ جمعہ آپ تخت پوش پر تشریف فرما کر دھیمی آواز سے وعظ مؤدبانہ طریقہ پر کتاب سامنے رکھ کر فرمایا کرتے تھے۔ لیکن آواز نہایت صاف تھی۔ عام مجمع تک پہنچ جاتی۔

جمعہ بیربل شریف کا ابتداء سے لے کر آج تک مشہور ہے۔ اور اکثر صلحائے امت نے یہاں اہتمام زیادہ تھا اور عام مسلمان آتے تھے۔ اور مجمع اچھا خاصا ہو جاتا تھا۔ حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سوا میں نے کسی بزرگ کے جمعہ کا یہ اہتمام نہیں دیکھا۔ ۱۵۔ ۱۶ کوس سے جمعہ کی اقتداء کے لئے عوام و خواص آتے تھے۔ ایک کمہار ماڑی ٹک جو ۱۳۔ ۱۴ میل پر ہے، سے متواتر چودہ سال بیربل شریف جمعہ ادا کرتا رہا۔

اُس زمانے میں اچھے لوگوں میں عام عادت تھی۔ کہ جمعہ کی اقتداء یا نماز کسی بزرگ یا عالم دین کی اقتداء میں پڑھی جائے۔ میاں کرم دین صاحب کے والد پنڈی لالہ تحصیل پھالیہ سے چل کر میانی، تحصیل بھیرہ میں مفتی صاحب کے پیچھے عمر بھر پڑھتے رہے، جو تقریباً ۱۶۔ ۱۷ کوس سے زیادہ فاصلہ تھا۔ جمعرات بعد نمازِ عصر گھر سے چلتے تھے۔ رات راستے میں گذار کر چاشت کو میانی پہنچتے تھے۔ پھر جمعہ کے بعد روانہ ہو کر رات راستہ میں گذار کر صبح آٹھ نو بجے گھر کام پر پہنچ جاتے تھے۔

ایسے ہی قطب دین صاحب کے والد پانڈوال سے چل کر میانی ۱۲ کوس فاصلہ پر جمعہ ادا کرتے رہے۔

میرے چچا حضرت محمد سعید صاحب رح جو نہایت موزوں تر قد و قامت کے مالک تھے۔ اور نہایت خوش آواز بھی، خطبۂ جمعہ دیا کرتے تھے۔ عام معمول حضرت قصوری رح کے خطبات پڑھنے کا تھا۔ اور بعدہٗ اُردو غزل موزوں رُوانی سے پڑھی جاتی۔ ان کے بعد آج تک کسی سے اِس وجاہت کا خطبہ میں نے نہیں سُنا۔

وعظ: حضرتِ اقدس رح عموماً ہر ماہ کے فضائل اور ہر ماہ کے متعلق عبادات وغیرہ کی تفصیلات سے وعظ فرماتے اور ساتھ ہی تقویٰ و اتباعِ سنّت کی طرف رغبت دلائی جاتی تھی۔ اور کبائر سے بچنے اور صغائر سے روکنے کے لئے مؤثر الفاظ میں وعظ فرمایا جاتا تھا۔

لیکن آج کی طرز نہیں تھی۔ نہایت سادہ، پاکیزہ اور متانت سے پُر وعظ ہوتا تھا۔ مجمع سر ڈالے سُن رہا ہوتا تھا۔ کسی کی کیا مجال کہ سر اٹھائے۔ اور اِدھر اُدھر دیکھے۔ افسوس کہ اُس وقت کا کوئی کلمہ مجھے یاد نہیں۔ یاد کیا ہوتا، اس عمر نادان میں جمعہ ادا کرنے کے بعد بچوں کی طرح بھاگ

Marfat.com

جاتا تھا۔

پڑتال: گاہ گاہ آپ عشاء کی نماز کے بعد پڑتال طلباء بھی فرماتے تھے، کہ جماعت میں کون شریک نہیں ہوا۔ اور دریافت پر جب معلوم ہوتا تھا کہ فلاں درویش یا صاحبزادہ شریکِ جماعت نہیں ہو سکا، تو درویش کا کھانا بند ہو جاتا تھا، اور صاحبزادے پر چار آنے جرمانہ فی جماعت۔ اور ہم بچوں کو چار دُب (لوکر) سے سزا ملتی تھی۔

ایسے ہی رمضان شریف میں بے روزوں کی تلاش ہوتی تھی۔ اگر کوئی معلوم ہوتا تھا کہ فلاں بے روزہ ہے، تو گدھے پر سوار کر کے اُسے ذلیل کیا جاتا تھا۔ عورتیں رمضان شریف میں پوشیدہ روٹی یا لسّی (چھاچھ) لے جاتی معلوم ہوتیں، تو درویش جا کر برتن توڑ دیتے اور روٹیاں کتّوں کے سامنے ڈال دی جاتی تھیں۔ درویش ایک قاہرہ فوج آپ کی تھی جس طرف حکم ہوتا تھا، تو لاپرواہ دوڑ جاتے تھے۔ بعض وقت بعض جہّال متکبّر سے بھی واسطہ پڑ جاتا تھا۔ جو مقابلہ کے لئے اپنی چوہدراہٹ اور اپنی زمینداری کے نشے میں ہوتے، سامنے آ جاتے تھے۔ لیکن حضرت کا فرمان تھا، خوف مت کھاؤ۔ ان کو مارو۔ اسی میں ان کی بھلائی ہے۔ اگر مار کھا کر آؤ گے تو ان کا نقصان ہے۔ کیونکہ ناراضگیٔ دین ان کو برباد کر دے گی۔

قلندریّت: جذبۂ قلندریت کی نظرِ عتاب ہر وقت بے دینوں کے سر پر تیغِ بُرّاں کی طرح چمکتی نظر آتی تھی۔ اور "یہ نگاہ کی تیغ بازی، وہ سپاہ کی تیغ بازی" کے دونوں نمونے اکٹھے نظر آجاتے تھے۔

نسبت ممزوجہ قلندریّت: سُبحان اللہ! یہ کیا نسبت بلند تھی، جس کے بارے آپ ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ "نسبتِ این فقیر ممزوجہ بہ قلندریہ است"۔ ایک طرف سالکانہ شریعت اور دین کی پاسداری ہے۔ اور دوسری طرف یہ قلندری اس کی محافظ۔ ایسا امتزاج کس فقیر کو نصیب ہوا؟ ہوں گے، لیکن بہت کم۔

ہمارے قبلہ حضرت میاں صاحبؒ بھی پاسداری شریعتِ حقّہ میں بے مثل و بے مثال تھے۔ فرق یہ تھا کہ یہاں جو حاضر ہوتا تھا، اس کی درستی مطلوب تھی۔ عام پرواہ نہ تھی۔ اور وہاں حاضری والے سے عام چھیڑ چھاڑ نہ تھی۔ بلکہ ایک حرف بھی منہ سے نہ نکالا جاتا تھا۔ جو کچھ اثر ہوتا تھا، خاموشی اور صورت سے ہوتا۔ لیکن عام امور پر پوری نظر تھی۔

گاؤں میں شادیوں پر عورتوں کا گانا اِس علاقہ میں عام تھا۔ ویسے بھی جوان بچیاں چاندنی میں باہر نکل کر گایا کرتی تھیں۔ لیکن حضرتِ اقدسؒ کے کان میں جب کبھی بھی آواز پہنچی، فوراً حکم ہوتا، جاؤ منع کرو۔ حکیم فیض احمد صاحب اور محمد عظیم صاحب حجام خصوصی اس خدمت کے لئے جایا کرتے۔ اور لڑکیاں ان کو دیکھتے ہی بھاگ جاتی تھیں۔

ایک خط: ایک بار حضرت محمد دین صاحبؒ سجادہ نشین سیال شریف بموقع عرس حضرت فضل دینؒ صاحب چاچڑ میں تشریف لائے۔ جسب معمول سازوں پر آپ نے قوالی کرائی۔ حضرتِ اقدسؒ کو خبر ہوئی، تو آپ نے خط لکھا کہ علاقہ فقیر کا ہے۔ اِس علاقہ میں تو اِعلانیہ یہ ناجائز ساز نہ بجائے جائیں۔ آپ اپنے علاقہ میں جو چاہیں کریں۔

سُبْحَانَ اللہ! وہ لوگ کتنی شریعتِ الٰہیہ کی پاسداری کیا کرتے تھے۔ حضرت سجادہ نشین صاحبؒ نے خط پڑھ کر جیب میں رکھ لیا۔ کسی نے عرض کیا کہ کیا لکھا ہے؟ فرمایا میاں! بزرگ ہیں احترامِ شریعت چاہتے ہیں۔

بےنفسیٔ فقراء: مرض الموت میں جب آپ پر فالج گرا۔ تو حضرت سجادہ نشین سیال شریف حضرت محمد دین صاحبؒ عیادت کیلئے بیربل شریف تشریف لائے۔ اور ملاقات مسجد کے دالان میں جنوبی حصہ میں ہوئی۔ دونوں بزرگ آمنے سامنے ایک فاصلہ پر تھے۔ اور مخلوقِ خدا کا حلقہ وسیع ان کو گھیرے ہوئے، گوش بر آواز تھا۔ پرانی صورتیں، پرانی سیرتیں کتنی دل نشین اور کتنی دِل کش تھیں، دِل میں کھُب (کھُر کر) جاتی تھیں۔ وہ نقشہ آج بھی یاد ہے۔ ایسا معلوم ہوتا کہ رحمتِ الٰہیہ اور انوارِ الٰہیہ کی بارش ہو رہی ہے۔ ورنہ نفس والوں کا اکٹھا ہونا کیسے ہو سکتا تھا، جبکہ آپ نے ان کو امرِ ممنوع یا مشتبہ میں ٹوکا بھی تھا۔

غرض آپ نے ایک ایسا مزاجِ صالح پایا تھا، خدا و رسول میں کوئی فرق نظر نہ آتا تھا۔ بعض بزرگ فنا فی اللہ ایسے ہوتے ہیں کہ رسالت کے آداب کی پروا نہیں ہوتی، اور بعض رسالت میں ایسے مدہوش ہوتے ہیں کہ آدابِ خداوندی کا خیال تک نہیں رہتا۔ بلکہ فرائضِ الٰہیہ کو بھی ترک کر بیٹھتے ہیں۔ لیکن رِسالت میں وہ چکتے ہیں اور ان میں رسالت چمکتی ہے۔ کلامُ اللہ کے پڑھنے پڑھانے میں صاحبِ کلام بھی بولتا ہوا نظر آتا ہے۔ اور دین اور اس کی شریعت میں وہ

تمام کچھ رہتا ہے، جس کے دم سے یہ دین اور شریعت ہے۔

ورنہ آج سب کچھ ہو رہا ہے۔ لیکن وہ ایک نہیں۔ باقی سب کچھ ہے۔ کسی عزیز نے ایک دینی رسالہ مجھے بھیجا۔ خدا معلوم دیکھنے کے بعد میں نے یہ لکھ دیا:

آئینہ کو دیکھ کر ششدر ہوں اللہ غنی
غیر حیرانی سکندر کا نشاں کچھ بھی نہیں

عزیز سمجھ گئے اور منہ سے کچھ نہ کہا۔

باب پنجم

مساجدُ اللّٰہ

تیسرا نمبر مساجد کا، کلام اللہ اور دین اللہ کے بعد ہے۔ مساجد کیا ہیں؟ کعبۃ اللہ کی نیابت گاہ۔ اور کعبہ کیا ہے؟ وہی جسے خانۂ خدا کہا کرتے ہیں۔ اُمتِ مسلمہ کی وحدت کا پہلا رشتہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کا ہے اور دُوسرا تعلق مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کا ہے۔ یہ ہے اعتقادی اور معنوی رشتہ۔ اس رشتۂ باطنی کے لئے ظاہری رشتہ کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اجتماعیت اپنا مرکز ظاہریہ چاہتی ہے۔ اور اس مرکز ظاہریہ کے سوا اجتماعیت ناممکن ہے۔ اس لئے مذہب، جو عقیدہ کی لڑی میں مُنسلک ہوتا ہے۔ اور اس وحدت کے ساتھ اجتماعیت کے افکار و اعمال وابستہ ہوتے ہیں۔ اس لئے اجتماعیت کے لئے ایک ظاہری مرکز کی ضرورت ہوتی ہے۔

اِس عقیدۂ خدائیت اور رسالت کے لئے کعبۃ اللہ کو چُن لیا گیا۔ مرکز خدائیت، خداوندِ احکم الحاکمین کے تمام احکامات کی ادائیگی کا مرکز ہوتا ہے۔ سب سے پہلا تعلق الٰہیہ کو بڑھانے کے لئے عبادت ہوتی ہے۔ اور اس کے بعد اُمتِ مسلمہ کا واحد سجدہ گاہ خصوصی ہے۔ جس کے سامنے تمام امت ہمیشہ سربسجود رہتی ہے۔ مشرق و مغرب کی تمیز نہیں حدود سے بالا ہو کر اس کی مرکزیت امتِ مسلمہ کے لئے ہے۔

اِس کے بعد معاشرت، تمدّن اور مساوات کیلئے اپنا نمونہ آپ ہوتا ہے۔ تمام اَفراد ایک لباس، اور ایک حال میں ہو کر پیش ہوتے ہیں۔ شاہ و گدا کی تمیز نہیں۔ خلقِ خُدا اپنے خدا کے سامنے ایک صورت ہو کر سربسجود ہوتی ہے۔ کسی کو کسی سے اِمتیاز حاصل نہیں۔

خود حاضر ہونے والے کے دِل میں یہ اِحساس ہوتا ہے کہ ہم ایک جیسے بندے ایک اپنے خدا کے سامنے حاضر ہو رہے ہیں۔ اور ہر دیکھنے والا بھی یہ خیال کرتا ہے کہ یہ تمام افراد ایک رشتۂ خدائی میں یکساں، حضور ربُّ العالمین کھڑے ہیں۔

اُمّت کے افکار و کردار اور اجتماعیت کا گہوارہ ہے، اور تربیت و تعلیم کا مرکز ہے۔ عدالت و احکام کا ایک مستحکم قلعہ ہے۔ غرض امت کے تمام فکری، معاشی اور ثقافتی اَدب کا خزینہ ہے۔ جہاں کتاب اللہ، فطرتی قانون و اخلاق اور تمدن کی معلّم اوّل ہے یہ کعبہ اُسی تعلیم کا مدرسہ ہے، جہاں پہلی تعلیم امّت خود جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم نے فرمائی۔ اور قرنِ اوّل کے شاگرد پیدا فرما کر دنیا کی رہبری کے لئے تیار فرمائے۔ پھر صرف مدرسہ نہیں بلکہ پاسبانِ امت ہے۔

مِنیٰ جانے والی صُبح کی پہلی شام: مغرب کی نماز پر احاطۂ خانۂ خدا بھرا ہوا میری نظر آیا۔ اور ہم تمام نماز کے لئے کھڑے ہوئے۔ تو اتنا جمِ غفیر تھا، کہ نظر نہ پہنچتی تھی۔ اِس اجتماعیت کو دیکھ کر بے اختیار میرے منہ سے یہ شعر اِقبال کا نِکلا: ع

ہم اس کے پاسباں ہیں وہ پاسباں ہمارا

اگرچہ کئی بار یہ شعر سُنا تھا۔ لیکن حقیقت معلوم نہ تھی۔ ہم اس کے پاسباں کیسے؟ اَور وُہ ہمارا پاسباں کیسا؟ اپنی پاسبانی بھی نظر آگئی۔ جو کچھ ہے یہ ہے۔ اور ہم بھی اس کی پاسبانی کر رہے ہیں۔ کہ ہزار سالوں گزر رہے ہیں کہ ہم اس کے محافظ و سرپرست ہیں۔ اور اس کی پاسبانی بھی نظر آگئی۔ اگر یہ خانۂ خُدا نہ ہوتا، تو ہم کیسے ایک رشتہ میں قائم رہ سکتے یہ اسی کی برکت اور محافظت ہے کہ ساری امّت و قوم کا رشتہ یکساں اتّحاد پر قائم ہے۔ دیکھیے، دینِ اسلام میں کتنے فرقے ہیں۔ کتنے مذہب ہیں۔ اور کتنے مسلک ہیں لیکن صرف ایک زاویہ پر سر جھکائے ہوئے ہیں۔ رُومی، ترکی، ہندی، روسی کا امتیاز نہیں سب مسلمان اور خدائے قدوس کے بندے اور کعبۃ اللہ کے زائر۔ یہی حال ہمارے معنوی مرکز قرآن کا ہے۔ کتنے فرقے ہوئے۔ کتنے مذہب پیدا ہو گئے۔ لیکن قرآنِ حکیم کو تمام تسلیم کرتے ہیں۔ اُور تمام ہی اس کے احکام کے سامنے سر بسجود ہیں۔ اور ہر ایک کا ماخذِ دین وہی ہے۔

قرآنِ حکیم اور کعبۃ اللہ، باوجود ہزاروں اختلاف کے ایک رکھے ہوئے ہیں یہی وجہ ہے کہ مسلمان ان کے احترام پر جان قربان کر دیتا ہے۔ اور جان سے اُسے عزیز خیال کرتا ہے۔ الفرادیت ختم ہوتی ہے اور اجتماعیت قائم ہوتی ہے۔

نائب مناب: نہ تو عام امت کعبۃ اللہ میں حاضر ہو سکتی ہے۔ اور نہ کعبۃ اللہ ہر اجتماعیت میں پہنچ سکتا ہے۔ اس لئے اللہ تعالےٰ کے حکم سے ہر اجتماعیت کے لئے مسجد کو کعبۃ اللہ کی ظاہری اور معنوی حیثیت دے دی گئی۔ اور یہ مسجد اپنے متعلقین کے لئے کعبۃ اللہ کے قائم مقام ٹھہرائی گئی۔ سجدہ گاہ کے علاوہ تمام ضروریات کا محور قرار دی گئی۔ یہ ہی مدرسہ ہے۔ یہی تربیت گاہ ہے۔ یہی عدالت ہے۔ یہی احکام خدائی کے جاری کرنے کا صدر مقام ہے۔ یہی کونسل کے مشورہ کے لئے کونسل خانہ ہے۔ غرض ہر امر اور ضرورتِ امت کے افرادِ متعلقہ کے لیئے ایک خزینہ ہے۔ قرونِ اولیٰ کی طرح اگر مسلمان اس کی طرف متوجہ ہو جاویں، تو ہمیں کسی عمارتِ قومیت کی ضرورت نہیں۔ یہی تعمیر گاہِ انسانیت ہو سکتی ہے۔ اور پھر اس کیلئے کسی خرچ و اخراجات کی ضرورت نہیں۔ پڑھنے پڑھانے والے، سیکھنے سکھانے والے راعی مرعی یکجاء بلا اُجرت خدمت کے لئے حاضر ہوتے۔ اور ایک وحدت میں منسلک رہتے ہوتے ملتِ اسلامیہ کے لئے باعثِ فخر ہوتے۔

تفاوت: لیکن جیسے ملت نے مرکزیتِ عوام، کعبہ سے لاپرواہ ہو کر اپنی ضروریات اجتماعیہ کے لئے دوسرے مرکز قائم کئے ہیں۔ اور دوسرے مراکز کو درجۂ اوّلیہ دیا گیا۔ اور کعبۃ اللہ کو صرف سجدہ گاہ تک محدود کر دیا گیا۔ بعینہٖ یہی حال مساجد کا ہو گیا ہے۔ کہ اپنے اصل کی طرح مساجد کو بھی نماز ادا کرنے کے لئے مخصوص کر دیا گیا۔ اور صرف یہی رشتۂ اخوت باقی رہ گیا۔ باقی رشتوں کے لئے مدرسہ، عدالتیں وغیرہ تربیت گاہوں کو قبلہ گاہ بنا دیا گیا۔ جس کی وجہ سے تمام اخوتِ اسلامیہ اٹھ گئی۔ اور یکسانیتِ افکار بھی جاتی رہی۔ تمدن و تہذیب کے رسم و رسوم بدل گئے۔ ہر ملک نہیں بلکہ ہر گاؤں اور ہر محلہ میں اختلاف پیدا ہوتے گئے۔ اختلاف غالب ہو گیا اور وحدت کمزور ہو گئی۔ اور دین فعالی حیثیت سے گر گیا۔

ہمارے حضرت اقدسؒ: لیکن ہمارے حضرتؒ اقدس نوّر اللہ مرقدہٗ نے اپنی مسجد پوری طرح کعبۃ اللہ کی نیابت گاہ بنا رکھی تھی۔ تربیتِ تہذیب کا خاص گھر تھی۔ مدرسہ کی حیثیت سے تعلیم و تعلّم وہاں ہوتا تھا۔ طریقت کے لئے خانقاہ کا کام دیتی تھی۔ فتووں اور فیصلوں کیلئے عدالت متصور ہوتی تھی۔ اور احکام و فرامین جاری کرنے کے لئے ایک سلطنت کا صدر مقام

تھی۔ غرض اِس مسجد میں وُہ تمام کام ہوتے تھے، جو رسولِ خدا صلّی اللہُ علیہِ وَآلِہٖ وَسلّمْ نے مسجدُ الرسول میں کیے تھے۔

آپ کی مسجد : آپ کی مسجد کیا تھی، ایک بقعۂ نور تھی۔ ہر داخل ہونے والا محسوس کرتا تھا کہ میں کسی مقامِ مقدّس میں داخل ہو گیا ہوں۔ ہر طرف ایک سناٹا ہوتا۔ اور ہر انسان اپنے شُغل میں مصروف ہوتا۔ کسی کو فرصت نہ تھی۔ کہ پھرنے والے پر نظر ڈالے۔ اپنے مطالعہ میں غرق اپنی تدریس میں غرق۔ اپنی تسبیح و تہلیل میں مصروف۔ اور فکر و ذکر میں مشغول اور مصرُوف۔ اور ہر حلقہ اپنے حلقہ کا ذمہ دار۔ ہر اُستاد اپنے شاگردوں پر نظر انداز۔ اور ہر شاگرد اپنے معلّم کے سامنے حیا سے پرُ۔

غرض مکین و مکاں اپنی سادگیٔ صُورت کے باوجود نورانیت سے پرُ تھا۔ اور کعبہ کے انوار معلوم ہوتے تھے، کہ براہِ راست برس رہے ہیں اُور یہ مسجد عین کعبۃ اللہ کی نیابت ادا کر رہی ہے۔ اور قوم و ملّت کی مرکز اور حقیقی محورِ زندگی و حیات ہے۔

مدرسہ تھا، خانقاہ تھی، کتب خانہ تھا، قیام گاہ تھی۔ غرض علم و عرفان کی واحد تربیت گاہ تھی۔ جہاں یہ امتزاجِ علمی و عملی اور روحانی کم دیکھنے میں آیا۔ علم و عمل یکساں جاری و ساری۔ طریقت و علمیت کا واحد رشتہ اور مرکز۔ اِس حسنِ امتزاج کی نظیر آج بہت کم ملتی ہے۔ لیکن اس زمانے میں اکثر مدرسے اور خانقاہیں ایک ہوتی تھیں۔ ایک طرف طلباء اپنے علم کے مطالعوں میں غرق ہوتے تھے، تو دوسری طرف سالکینِ راہِ ہدایت استغراق و محویت میں عالمِ بالا کی سیر کر رہے ہوتے تھے۔

غرض ایک مسجد خانۂ خدا تھی اور امّتِ محمدیہ کی اجتماعیت کی تمام ضرورتوں کی کفیل تھی۔ اور دینی ضرورت کے مہیا کرنے کی ذمہ دار۔ اختلاف کا نام و نشان نہ تھا۔ سب ایک خدائے قدوس کے بندے نظر آتے تھے۔ اور ایک رسول ؐ کی امت کہلانے کا فخر خیال کرتے تھے۔ عین مظہرِ کعبۃ اللہ تھی اور صحیح معنوں میں

ع "ہم پاسباں ہیں اس کے، وُہ پاسباں ہمارا"

صادق آتا تھا۔ ذرا سوچئے، یہ پاسبانی کون سی ہے۔ تلوار و بندوق لے کر پہرہ دینے کا

نام ہے، یا کچھ اجتماعیّت کے سہارے کا نام پاسبانی ہے۔ اور اسے حقیقتاً مسجد اور کعبہ کی پاسبانی کہنا چاہیئے۔ ہماری اجتماعیّت امتِ مسلمہ کو قائم رکھنا اور ایک ایک فعل وحرکت کا نگہبان ہونا۔ کوئی امر خلافِ شرع واقع نہ ہو جائے۔ کوئی روش ہمارے اسلاف کی، ہاتھ سے نہ چھوٹے۔ ہم تقویٰ واخلاص کے اعلےٰ نمونہ پر قائم رہیں۔ ہمارے اندر اسوۂ حسنہ کی جھلک چمکتی دمکتی رہے۔ ہماری روش اسلامی ہو، خدائی ہو رسُولی ہو۔ غرض ہر ایک اُمر اسلامی اور ہر ایک تاثرِ دین سے لبریز ہو۔ کہنے سے پہلے ہمارے حال سے وہ کچھ عیاں ہو، جو ہم کہنا چاہتے ہوں۔

مسجدِ شاہی لاہور میں جب کبھی حاضر ہوتا ہوں، اس کی وسعت بیکراں۔ اور اس کے حجُرے گنتی سے باہر، اور صحن فراخ۔ اور اس کی ویرانی کو دیکھتا ہوں، تو اس کی عظمت کا زمانہ سامنے آجاتا ہے۔ جبکہ وہ اپنی عظمت کے ساتھ اپنی دینی اجتماعیّت کی مالک ہوگی۔ جب شاہ نماز کے لئے اندر داخل ہوتے ہوں گے، تو تِل دھرنے کی جگہ نہ ہوتی ہوگی۔ لیکن اَب صحرا نظر آتی ہے۔ صرف عمارت کی زیارت کے لئے جاتے ہیں۔ کسی بلند مقصدِ حیات کے لئے کوئی داخِل نہیں ہوتا۔ ایک زمانہ تھا مَنْ دَخَلَ کَانَ اٰمِنًا کا پورا عکس تھی۔

اَب کتنا روپیہ لگایا گیا، کتنی مرمّت ہوئی۔ بعینہٖ اَصل صُورت پیش کرنے کا حکومت اِرادہ رکھتی ہے۔ لیکن کوئی یہ بھی تجویز پیش کردیتا۔ یا کسی بلند خیال مسلمان کے ذہن میں یہ بھی آجاتا کہ اُس کی معنوی صُورت پر توجہ دی جائے۔ اور اس کو صوبہ بھر کی رُوحِ اِسلام کا اصل مرکز بنانے کی کوشش کی جائے۔ اَب تو صرف جُمعہ کے دِن بھی یہ بھرپُور نہیں ہوتی۔ تاہم اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ پہلے کی نسبت مسلمانوں کی توجہ زیادہ ہے۔ ایک وُہ بھی وقت تھا جب مسجد میں عام پنجگانہ نمازمیں دو چار آدمیوں کے سوا کوئی نہیں ہوتا تھا۔ اور جمعہ کو ایک دو صفیں ناتمام ہوتی تھیں۔ اور نہیں تو عید پر بھرپور ہو جاتی۔ اور خدائے قدوس کی جلوہ آرائی کا مہبط نظر آتی ہے۔ عدالتوں میں جائیے۔ کالجوں میں جائیے۔ جلسہ گاہوں کو دیکھیے۔ حتّٰی کہ سینماگھروں کو ملاحظہ کیجیے، سب بھرپور ہیں۔ اور اجتماعیّت اپنی بے دین رونق سے بھرپور ہے۔ لیکن بے رونق تو خانۂ خُدا ہیں، جو حقیقتاً اجتماعیت کے فطرتی گھر تھے۔ اب بھی مسلمان توجہ کریں۔ اُسے قرآن، تفسیر، فقہ اور تاریخِ اسلام کا گھر بنائیں بلکہ

کے نامور اور چیدہ علماء کرام کو اس کے لیئے منتخب کر کے اسلامیات کے مختلف موضوعات کے لیئے درس دلانے کی تجویز کی جائے۔ اور صوبہ بھر کا دیندار علمی طبقہ ایسے درس وتدریس سے بطور لیکچر فائدہ اٹھائے۔ رات کو عبادت گذار اپنی سجدہ ریزی سے اسے زندۂ شب بنائیں۔

غرض ایسی صورت میں عام وخاص مسلمانوں کو معلوم ہو جائے گا کہ مسجد دین و تہذیب اسلامی کا مرکز ہے اور قابل ترین علمائے کرام سے تبادلۂ خیالات کا موقعہ میسّر ہونے کی صورت میں علوم اسلامیہ کے وہ جوہر کھلیں گے، جن کا کسی دوسری جگہ سے ملنا مشکل اور ناممکن ہے۔ میں نے اپنا یہ خیال کئی دوستوں سے ذکر کیا۔ لیکن آج سب نظریں اس حقیقت کو کیسے دیکھ سکتی ہیں۔

یہاں پر جس مسجد کا ذکر شروع ہے، اس مسجد کے گوشہ نشین کو دیکھنے کیلئے نہیں، بلکہ زیارت کے لیئے مختلف اضلاع کے عوام وخواص آتے تھے۔ اور ان کی اقتداء میں نماز ادا کرنے کو اتنا باعثِ برکت خیال کرتے تھے، جیسے کعبۃ اللہ میں نماز ادا کرنے کی برکت خیال کی جاتی ہے۔ دینی مقتدر ہستیوں کا دیکھنا ھی دین پیدا کر دیتا ھے اور ان کے چہرے بُشرے تمام خط وخالِ دین پیش کر دیتے ہیں۔ اور بھولے ہوئے نشان سامنے آجاتے ہیں۔ اور اشتیاق ومحبتِ دینی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور بقول حضرت سلطان باہوؒ:

بن پڑھے ہی پیا پڑھیوے ہُو

یعنی پڑھنے کے بغیر ہی پڑھا جا رہا ہے۔ یعنی وہ سب کچھ حاضر ہو جاتا ہے، جس کو حاضر کرنے کے لیئے محنت ومشقّت درکار تھی۔

بہر صُورت ہماری وہ مسجد جس کا ہم نے نقشہ پیش کیا، جو ہزاروں لاکھوں انسانوں کے لئے باعثِ ہدایت رہی۔ اور فیوضاتِ ظاہریہ و باطنیہ سے عوام وخواص کی تشنگی بجھاتی رہی اس کا رقبہ کُل تقریباً ۵۲، ۶۳ مربع فٹ، شمالاً جنوباً ۵۲ فٹ تھی، اور شرقاً غرباً ۶۳،۴ فٹ تھی۔ جس کے اندر مسجد کا اندرون خانہ اور بیرون برآمدہ ۴۰ فٹ طول، ۱۴ عرض۔ ہر ایک کا تھا۔ اور پانچ حجرے اور تین برآمدے مختصر تھے۔ جس میں سے شمالی حجروں میں حضرت اعلیٰ کا خود قیام تھا۔ اور برآمدہ میں آپ کی مسند تھی جو صرف ایک مصلیٰ پر بچھا رہا کرتی تھی۔ عام طور پر

قالین سُوتی ہوتی تھی۔ اور ایک بڑے تکیہ پر آپ تکیہ زن ہوتے۔ رُخ مبارک شمال کو ہوتا تھا اور پشت مبارک مسجد کی شمالی دیوار کے ساتھ۔ اکثر پاؤں پھیلا رکھا کرتے، کیونکہ آپ کو بواسیر کا مرض لاحق تھا۔ مسجد کے اندر وضو کی جگہ بھی تھی۔ اور زائرین کے لیے پانچ افراد کی گنجائش تھی۔ درمیان میں سلطان الاشجار (شریہ بہت بڑا)، اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ کے مطابق ساری مسجد پر پھیلا ہوا تھا۔ مسند کے شمالی رُخ تین اور مشرقی جانب دو آدمی کے بیٹھنے کی جگہ تھی۔ اور قریباً ایک سو سے زائد طلبہ پڑھتے تھے۔ ساٹھ کے قریب درسِ نظامیہ میں شامل ہوتے اور باقی قرآن خوان۔ ناظرہ بھی پڑھا جاتا تھا۔ اور حفظ بھی۔ اور اپنی اولاد کو حضرتِ اعلیٰ نور اللہ مرقدہٗ حفظ ہی کرایا کرتے تھے۔ خواہ کوئی کتنا ہی غبی ہو۔

میرے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اُستاد ایک حافظ سیر اقوام، جن کے پاؤں نہیں تھے۔ اور ہاتھوں میں بڑا زور تھا۔ جیسے کہ فطرتِ خدائی کا یہ راز ہے۔ اور پڑھانے میں زیر زبر کے فرق پر اِتنا بے تحاشا مارا کرتے تھے۔ ہمارے حضرت (والد صاحب) کے ایک ہم سبق، جو ذہین نہ تھے کو بہت مارا کرتے تھے۔ وہ سبق یاد نہیں کر سکتے تھے۔

ایک دِن اُس نے اپنے باپ سے شکایت کی، کہ مجھے بہت مارتے ہیں۔ اُس کے باپ نے کہا، حفظ تو کرانا ہے۔ کیونکہ بشارت ہے کہ حافظ کا باپ عرش کے سایہ میں قیامت کو ہوگا۔ تو اس بے چارے نے جھٹ کہا، بابا پھر میرے حفظِ قرآن کی وجہ سے تو سایہ میں نہیں بیٹھ سکتا۔ اُس زمانے کی تعلیم کی بنیاد مار اور صرف مار پر تھی۔ اس وقت کی تعلیم میں نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ جو کچھ پڑھایا جاتا نقش بر آب نہ ہوتا۔ بلکہ پتھر کے نشانات اَنمٹ ہوتے تھے۔ جن جن حفاظ نے ان سے یاد کیا، پھر عمر بھر ان کو قرآن دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ کلیتہً محفوظ، زیر و زبر، واؤ کا فرق نہیں آیا۔

— درمیان میں سرس کا درخت تھا۔ اگر اسے طوبیٰ سے تعبیر کیا جاوے تو یہ مجاز صحیح ہوگا۔ آپؒ فرمایا کرتے تھے۔ جب کبھی اس پر نظر پڑتی ہے، وہ کچھ دیکھنے میں آتا، جو نہ سُننے میں آتا ہے اور نہ بیان کرنے میں (سراسر شہودی جلوے ہوتے ہیں)

باقی تین حجروں میں ایک میرے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ، دُوسرے مشرق

میں میاں شاہ عالم صاحب مفتی، مُعلِّم قرآن و کتب، تیسرے شمال میں میرے چھوٹے چچا علیہ الرحمۃ، جو اپنا درس قرآن رکھتے تھے۔ اور ان کا اور میاں صاحب کا درس شرقیہ تر درے میں، جو دونوں حجروں کے درمیان ہوتا۔ یہ مختصر عمارت اِقامتی یونیورسٹی کا نمونہ تھی جس کے لئے اب لاکھوں کروڑوں کے اخراجات برداشت کئے جارہے ہیں۔ اور پنجاب کے اکثر اضلاعِ مغربی کے طلبا بلا خرچ و مصارف پڑھا کرتے۔ اور ثقہ عالم ہو کر نکلتے تھے۔

یہ مسجد عام مسجد نہ تھی بلکہ وہ مسجد تھی، جس کی بُنیاد حضرت محمد اسلم صاحبؒ نے رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ۔" اے خدا! ہم سے یہ توبہ قبول فرما، کیونکہ تو سنتا جانتا ہے" مانگ رکھی تھی۔ اور یہی عکسی دعائیں تھیں، جو حضرت خلیل اللہؑ کی زبانِ مبارک سے کعبۃ اللہ کے بنانے کے وقت آپ کی زبان پر تھیں۔ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ۔ فرق اتنا تھا، وہاں رسولؐ کی طلب تھی اور یہاں ایک ولی اللہ کی طلب تھی۔

کیوں، اِس لئے جب آپ نے مسجد کے اندر طاقچے بہت سے بنوائے (جو تقریباً ۷۶ ہیں)، تو کسی نے آپ سے کہا کہ آپ کیوں اِتنے طاقچے بنوا رہے ہیں۔ فرمایا شاید کوئی عزیز آئے اور اس کے طلبا یہاں کتابیں رکھیں۔ آپ خود بھی عالم تھے۔ فقہ میں اچھا خاصہ درک تھا۔ بعض مسائل پر فتوے دیکھے گئے۔ البتہ آپ کے والدِ ماجد اور حضرت اعلیٰ کے جدِ امجد حضرت صدرالدین صاحب بہت بڑے عالم تھے۔ اور اپنا کتب خانہ بھی رکھتے تھے۔ غرض پاک نسل کے بزرگوں کی دعاؤں سے یہ مسجد مکمل نمونہ خدائے قدّوس کے خانۂ عظمت کا عکسِ کامل تھا۔ اور اجتماعیتِ اسلام کا واحد مرکز۔ اپنے علاقہ میں مشہور و معروف تھا۔ سالوں یہ مسجد خدمتِ اسلام بجالاتی رہی۔ اور اپنے علاقہ ملحقہ کے لئے دین و ایمان کا ایک قلعہ رہی۔ جس کی ضیا پاشی مغربی اضلاعِ پنجاب پر ایک عرصہ تک ہوتی رہی اور ہزاروں نے علمی و عملی فیوضات اُٹھائے۔ اور ایک عالم کی طرح ان کے ستارے چمکتے دمکتے رہے۔ اس وقت اگرچہ وُہ ٹھاٹھ تو نہیں۔ لیکن مسجد کاہ مومنین ضرور ہے۔ اور اس کے اندر داخل ہوتے سے ایک قلبی سکون اور روحانی سرور تو ضرور حاصل ہوتا ہے۔ البتہ علم کا چشمہ خشک

ہو کر صرف ایک مسجد رہ گئی۔ اللہ تعالیٰ سے دُور نہیں کہ از سرِ نو زندہ کرے اور کوئی خاندان مرتضوی کا چمکتا ستارہ پھر پیدا ہو جائے۔ جو اپنے اسلاف کے نمونہ پر پھر اسے از سرِ نو حقیقی زندگی بخشے اور وہی درس و طریقت یکجا کر کے اسلام حقیقی کا درس دے۔ مولا کریم سے کچھ دُور نہیں۔ حضرتؒ فرمایا کرتے تھے کہ حافظ صاحب کی دُعا تھی کہ سات پُشت تک ہماری اولاد پشتارہ لکڑی نہیں اٹھائیں گے۔ اگر وہ علم پڑھتے پڑھاتے رہے، ہم بھی چند پُشت اور دھکیل دیں گے یعنی ایک دو پُشت تک ہماری دُعا بھی قبول ہو گی اور آئندہ نسل علم عمل سے سرفراز رہے گی۔ یہ راقم الحروف ساتویں پشت اس دعا کے نتیجہ پر ہے۔

ابتدائی ایام میں جبکہ خاندان میں تنزّل آ رہا تھا۔ اور وقار گھٹ رہا تھا، تو مجھے خود کئی بار یہ خیال آتا تھا کہ دُعا تو ہے لیکن دیکھئے ہم کیسے سہارا لے سکتے ہیں۔ بزرگ چلے گئے دُنیا بدل گئی، حالات اُلٹ گئے۔ خیالات تبدیل ہو گئے۔ اس صورت میں ہمیں کیسے سہارا اس دنیا میں ملے گا۔ کالجوں، سکولوں میں بھٹکتے پھرے۔ اور سالوں گذر گئے۔ مسجد پر ایک نیند طاری ہو گئی۔

عشاء کا وقت تھا۔ نمازِ عشاء ادا ہو چکی تھی۔ میرے قبلہ و کعبہ والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ مسجد کے صحن بسترِ راحت پر لیٹے ہوئے تھے۔ میاں شاہ عالم صاحب، جو حضرت کے مفتی تھے۔ اور میں رخصتوں پر گھر آیا ہوا تھا، تو اچانک میاں صاحب نے حضرتؒ کو مخاطب فرمایا۔ یہ نواب صاحب ملازم ہو گئے۔ چھوٹے بھی انگریزی پڑھنے لگا دئیے۔ فتوے کون لکھے گا۔ مسجد میں کون ہو گا۔ تو آپؒ نے بے اختیار بلند آواز سے فرمایا۔ یہ میرا بیٹا فتوے لکھے گا اور مسجد میں ہو گا۔

حضرت نے وصال فرمایا۔ میاں شاہ عالم صاحب رخصت ہو گئے۔ مسجد ایک ویران صورت میں اُداس نظر آتی تھی۔ کہ یکایک میرے خیال بدلے۔ اور مَیں ملازمت ترک کر کے گھر آگیا۔ کسی زمانے کنز، ھدایتہ پڑھا تھا۔ کچھ نشانات ذہن میں تھے۔ آخر میں ایک مسندِ فقہ پر بیٹھا تھا۔ اور بیربل کا اعتماد قائم۔ اس لئے استفتاء برابر آتے تھے۔ مَیں نے مطالعہ شروع کیا۔ اور فقہ کے ابواب پر نظر دوڑائی۔ ذوقِ سلیم تھا، فطرتِ صحیحہ تھی اس

Marfat.com

لیے چند ہی دنوں میں اپنے کام پر حاوی ہوگیا۔ اور اسلاف کی طرح مجھے اعتماد حاصل ہو گیا۔ اور جب تک میرے قویٰ سالم رہے۔ یہ خدمت اور تبلیغی خدمت ہر جمعہ کو بدستور سابق ادا کرتا رہا۔ اللہ تعالےٰ نے زبان و بیان میں برکت بخشی۔ جو میں کہتا تھا، وہ دلوں میں بیٹھ جاتی تھی۔ اور ذہن قبول کرتے تھے۔ اور میں اپنے پیر و مرشد کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ان حضرات کے طفیل ہی آج جو کچھ برکت میرے دل میں ہے، ہے۔ اور بفضلہٖ تعالیٰ دینی اقدار روشن نظر آتے ہیں۔ گو وہ پہلی سی بات نہیں، بلکہ اس کے عشرِ عشیر بھی نہیں۔ تاہم مسجد ویرانہ بھی نہیں۔ ایک آباد مسجد ہے۔ قرآنِ حکیم کا درس ہے اور ایک دو عالم بھی مقیم ہیں۔ جو دینی صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ فرق یہ ہے کہ طلباء نہیں۔ نہ حقیقی طلباء ملتے ہیں اور نہ ہی کامل اہتمام ان کے لیے کیا گیا ہے۔ اللہ تعالےٰ یہ کمی پوری کرے، کہ مدرسہ و خانقاہ یک جا نظر آئے، جو نقشبندیہ کا طرۂ امتیاز ہے۔

بارگاہِ الٰہی سے پوری امید ہے کہ اسلاف رحمۃ اللہ علیہم کے برکات اور خصوصاً حضرت محمد اسلم رحمۃ اللہ علیہ کی خلیلی دعاؤں سے یہ مسجد ایک مدتِ دراز تک سعی و تبلیغ کا فریضہ پورے احترام سے ادا کرتی رہے گی۔ اور علاقہ کے لیے ایک اسلامی مینار خیال کی جائے گی۔

کیا لکھنا چاہتا تھا، کہاں چلا گیا۔ لکھنا تو چاہتا تھا کہ حضرتِ اقدس رحمۃ اللہ علیہ کو مساجد کے ساتھ غیر معمولی محبت اور شغف تھا۔ حضرت قبلہ میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ اکثر فرمایا کرتے تھے۔ بیربل والوں کو مساجد کا اتنا شوق تھا کہ راستہ کے ہر موڑ پر مسجد بنوا دی ہے۔ گاؤں سے خانقاہ تک جو بہت کم فاصلہ، اس کے درمیان میں بھی ایک سجدہ گاہ اب بھی نظر آتی ہے اور ساتھ دوسری بھی۔

محبت و شفقت کا یہ حال تھا۔ لیکن جب کبھی اپنے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی مسجد کچی کو پکی بنوانے کا خیال آتا تھا، تو معاً خیال آتا تھا۔ بزرگوں کی بنائی ہوئی کتنی متبرک ہے۔ کیسا نشانِ والد رحمۃ اللہ علیہ ہے۔ جب خیال آیا، یہی خیال غالب ہو گئے۔ یہاں تک، سردار شیر خان مرحوم اور سردار حاجی فتح خان مرحوم، جو کوٹ بھائیخان کے رئیس تھے، حضرت اعلیٰ رحمۃ اللہ علیہ کو نشتر اسی بیگھہ زمین کا ایک ٹکڑا پیش کر دیا۔ جبکہ حکومتی نالہ کی تجویز ہوئی۔ نالہ آیا، زمین آباد ہوئی۔ لیکن ساتھ ہی حضرت نے مسجد کی بنیاد رکھ دی۔ مسجد کیا تیار ہوئی، اس علاقہ میں اپنا نمونہ آپ تھی۔ یہ ضلع بھر کے کئی اضلاع میں اس نمونہ کی مسجد اس وقت تیار نہ ہوئی تھی۔

نقش و نگار کا یہ حال تھا کہ ایک چپہ دیوار خالی نظر نہ آتی تھی۔ اور دیواروں پر آیات و اشعار رنگا رنگ بقلم مولوی حبیب اللہ مرحوم ساکنہ سیرے (گجرات) لکھائے۔ چھت کیا تھی۔ ایک آسمانِ علم تھا۔ آیاتِ الہٰیہ کے سوا شجرہ ہائے خاندانِ تصوف و فقر درج تھے۔ حاشیہ پر اَسْمَآءُ الْحُسْنٰی تھے۔ اور ایک طرف حاشیہ پر اسماء مکرم حضرت رسالتمآب صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم نہایت خوش واضح طور رنگا رنگوں سے نظر آتے تھے اور یہ شعر بھی درج تھا کہ ؎

اگر فردوس بر روئے زمین است

ہمین است و ہمین است و ہمین است

الحق، اس کی موزونیت، اس کے حسن و جمال پر صبح صادق آتا تھا۔ صحن بہت بڑا تھا۔ چہرہ پر اَفْضَلُ الذِّکْرِ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ الرَّسُوْلُ اللّٰہِ، چُونے کے موٹے حروف میں تھا اور دائیں طرف، مشہور شعر: ؎

چراغ و مسجد و محراب و منبر

ابوبکرؓ و عمرؓ، عثمانؓ و حیدرؓ

بائیں طرف یہ شعر اُبھرا لکھا تھا: ؎

تابع شرعِ رسولِ مجتبیٰؐ

اُحمدی، حنفی، غلامِ مرتضیٰؓ

ان کے زمانے میں دُور دُور سے مسجد کی زیارت کے لئے لوگ آتے تھے۔ کیونکہ اس زمانے میں کوئی ایسی مسجد خوبصورت تیار نہ ہوئی تھی۔ جمعتہ الوداع رمضان شریف میں وہاں ادا ہوتا تھا۔ اور خلق اللہ دُور سے شامل ہوا کرتی تھی۔ اس پر حضرت نے بہت سا روپیہ لگایا تھا۔ مرورِ زمانہ غیر آباد ہونے اور سیم کے اثر سے اس کے تمام نقش و نگار مٹ رہے۔ مرمت بھی دوبارہ ہوئی لیکن سیم اسے کھاتی جاتی ہے۔ قابلِ زیارت ہے۔ لیکن یہ اکیلا مسجد کا مکان ہی نہ تھا۔ بلکہ مسجد کے ملحقہ شمالی جانب عمارات کی ایک قطار تھی۔ دو حجرے مسجد کے ساتھ متصل تھے۔ ایک کا دروازہ مسجد کی طرف کھلتا تھا۔ اور ایک باہر کی طرف تھا۔ دریچے تھے۔ اس کے اندرون حجرے پر بنگلہ ہوادار تھا۔ ہر طرف دریچے تھے۔ چادر چھت تھے۔ پھر مشرق کو ستر ہاتھ چھوڑ کر ایک دالان تردرا

اور ایک حجرہ مشرقی جانب تھا۔ اور پھر ڈیوڑھی تھی۔ جس کا دروازہ نہایت عالیشان تھا۔ مینار بلند مسجد سے بھی تھے۔ غرض شمالی مکانوں نے مسجد کا صحن گھیرا ہوا تھا۔ اس وقت محسوس ہوتا تھا شاید مستقل رہائش کے لئے یہ مسجد اور حجرے، دالان تیار ہو رہے ہیں۔ ان کی عمارت ۱۳۱۰ سنہ سے شروع ہوئی۔ اور غالباً ۱۳۱۶ سنہ میں ختم ہوئی۔ "اشتر آہستہ می رود"۔ شب و روز کے مطابق کام چلتا تھا۔

خاکہ: کسی عمارت کا نہ تو کوئی نقشہ تجویز فرماتے، نہ مستری کو کوئی تجویز لمبائی چوڑائی کی فرمائی جاتی تھی۔ صرف یہ کہہ دیا جاتا، مسجد اچھی و خوبصورت بنانا۔ پھر جیسے مستری، کاریگر کی مرضی۔ ویسی ہی تعمیر ہوتی تھی۔ کوئی دوسرا آدمی نگران بھی نہیں ہوتا تھا۔ غرض اہل اللہ کو عام دیکھا گیا۔ صرف ارادے تک ہر تعمیر محدود ہوتی تھی۔ پھر کوئی سروکار تعمیر کے ساتھ نہ ہوتا۔ وہ جانے اور اس کے فضل و کرم۔ تجویز دوسرے کرتے ہیں، مصالحے دوسرے لاتے ہیں، تعمیر دوسرے کرتے ہیں۔ ان اہل اللہ کی تو صرف ایک نظر ہوتی۔ گاہ بہ گاہ دیکھ لیا۔ پھر دیکھنے کے بعد نہ نقص نکالنے کا خیال، نہ کچھ اور پسندیدگی کا اظہار ضرور ہوتا تھا۔ اور بعض وقت چہرے پر کشید کی صورت نمودار ہوتی تھی۔ لیکن منہ سے ایک لفظ نہیں فرمایا جاتا۔

بیماری کی حالت میں بھی جمعہ کو چارپائی پر باہر تشریف لاتے تھے۔ ایک دوبار ایسے ہی ہوا۔ لیکن اس کے سوا کچھ نہیں۔ چند منٹ نظر دوڑائی، پھر واپس تشریف لانے کا حکم ہوتا تھا۔ اسی ۱۳۱۶ سنہ میں سرہند شریف کی زیارت سے واپس آئے اور آپ بیمار ہو گئے۔ اسہال تھے، اور اپنے والدِ بزرگوار اور دادا بزرگوار کے مزارات کے مجاور کی جھگی میں مقیم ہوئے۔ تقریباً دو ماہ علالت رہی اور اسی جھگی میں بیماری بسر کی۔ خدام وہیں رہا کرتے تھے۔ صاحبزادگان آیا کرتے تھے۔ ارشاد فرمایا کہ عیدگاہ کے اندر مسجد تعمیر کی جائے۔ پہلے ایک چھوٹی سجدہ گاہ صرف۔ صحنچہ قبور کے ساتھ متصل بھی تھا۔ اس کی ایک بنیاد رکھی گئی۔

بعض خواص سے بعض وقت فرماتے، کہ خیال تو باہر کا تھا۔ لیکن والدِ بزرگوار فرماتے ہیں کہ زندگی بھر دوری رہی۔ اب موت کے بعد بھی دوری پسند نہیں۔ اس لئے اب یہاں کا خیال غالب ہے۔ دیکھئے مولا کریم کو کیسے منظور ہے۔ آخر وفات کے بعد آپ کا دفن مسجد کے جنوب میں ہوا۔ آپ کے والد صاحب کی خانقاہ جو جزوی طور متصل ایک مقبرہ بھی ہے

مسجد خانقاہِ معلّٰی: ۱۳۱۶ھ کے بعد اس مسجد کی تعمیر شروع ہوئی۔ چونکہ کام ہمیشہ صرف ایک دو مستری کیا کرتے تھے۔ وہ بھی کئی ماہ کے ناغے ہو جاتے تھے۔ اس لئے تقریباً دو سال کے عرصہ میں سادہ تیار ہوئی۔

حضرت کی طہارت و تقویٰ کی مثال: قاری اللہ بخش صاحب سکنہ فیض پور کلاں تحصیل شرقپور شریف، حضرتِ اعلیٰؒ کے خلفاء میں سے تھے۔ اور وہ زیارت کے لئے بیربل شریف حاضر تھے۔ ایک دن حضرتِ اعلیٰؒ نے دریافت کیا، قاری صاحب، مسجد کی تعمیر ہو رہی ہے؟ عرض کیا جی ہاں، لیکن تعمیر کے ساتھ حقہ بھی پیا کرتے ہیں۔ ایک ہاتھ اینٹ کو لگاتے ہیں۔ دوسرے ہاتھ سے حقہ پیتے ہیں آپ یہ بات سن کر حیران ہو گئے۔ پھر فرمایا، مستری حقہ پیتے ہیں؟ قاری صاحب نے کہا، جی حضور، پھر آپ خاموش ہو گئے۔ یہ عصر کا وقت تھا۔ جب صبح ہوئی، اور مستری کام پر اپنے گھر سے آئے، تو احمد بخش خوجہ لانگری کو بلوایا اور فرمایا مستریوں کو بلوایا جائے۔ تعمیلِ ارشاد پر مستری حاضر ہو گئے۔ آپ نے ایک تھال بھرا روپوں کا پیش کر دیا۔ اور فرمایا۔ اپنی اجرت اٹھا لو۔ کام بند۔ مستری حیران، کیا ماجرا؟ تعمیر مکمل بھی نہیں ہوئی، اور کام بند ہونے کا حکم ہوتا ہے۔ عرض کیا، کیا لغزش ہوئی۔ فرمایا: متقدمین جب عمارات شروع کرتے تھے، قرآن شریف کے ختم کراتے تھے۔ بابا فرید شکر گنج رحمۃ اللہ علیہ کے روضہ مبارک کی ایک ایک اینٹ پر ختم ہوا ہے۔ اور ختم ہونے پر اینٹ لگائی گئی۔ اور تم لوگ ہو کر مسجد بناتے ہو، اور حقہ پیتے ہو۔ طہارت کی جگہ ایک مکروہ فعل مسجد کے اندر کھلا کرتے ہو۔ ایسے مستریوں کی ضرورت نہیں۔ کسی دوسرے سے کام کرا لیا جائے گا۔ اس پر مستری معذرت خواہ ہوئے اور آئندہ کے لئے احتیاط کا پختہ وعدہ کر کے معافی چاہی۔

مسجد کی تعمیر کے ساتھ میاں رمضان مرحوم درویش نے ایک مختصر باغیچہ بھی لگا دیا۔ مرحوم میں یہ خوبی تھی۔ چند دن کے اندر باغ بہار بنا دیتے تھے۔ چنانچہ آڑو، سیب دیسی شہتوت لگا دیئے۔ جو دوسرے تیسرے پھل لاتے۔ اور پھر ساتھ آم کے پودے لگانے شروع کر دیئے۔ غرض دو تین سال کے عرصہ میں اکثر پودے پھل آور ہو گئے۔ اور درخت پھر آم بھی پھلنے پھولنے شروع ہو گئے۔ جن کی وجہ سے خانقاہِ معلّٰی پر خاصی رونق ہو گئی اور دو تین سال کے بعد آپ کا وصال ہو گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

اِس تمام تحریر سے مقصود یہ دکھانا تھا، کہ آپ کو مساجد اور ان کی حقیقی آبادی کے ساتھ بہت محبت تھی۔ خصوصاً علم پڑھنے اور پڑھانے کا بہت شوق تھا۔ تمام اولاد کو حافظ، عالم دیکھنا چاہتے تھے۔ آپ کی طریقت کی گو بڑی دھوم تھی اور کشمیر، لاہور تک فیض یاب ہونے کے لئے سالکینِ راہِ ہدایت آیا کرتے تھے۔ لیکن طبعی رجحان علم کی طرف تھا۔ غالباً آپ علم کو اکتسابی خیال فرماتے تھے۔ اور طریقت کو ایک .... موہبتِ الٰہیہ شمار فرماتے۔ کیونکہ آپ فطرتاً مادر زاد ولی اللہ تھے۔ اور وہ تمام ان کو بچپن میں حاصل تھا۔ جو اکتساب کے بعد کسی کو حاصل ہوتا ہے۔ مثلاً ایک بار حضرت کے چہرہ پر زنبور نے ڈس دیا۔ اور آپ کی آنکھ متورم ہوگئی۔ جب اعلحضرت للّٰہی رح کی خدمت میں سبق کے لئے پیش ہوئے، تو حضرت نے تبسم فرمایا۔ اور آپ رح نے اس کا بڑا احساس فرمایا۔ وہ اُستاد تھے، یہ شاگرد۔ وہ پیر تھے یہ مرید۔ لیکن قدرتِ خدا دوسرے دن وہی آنکھ اعلحضرت رح للّٰہی کی متورم تھی۔ اور زنبور نے آپ رح کو کاٹ رکھا تھا۔ پھر اعلحضرت رح سامنے ہوئے تو فرمایا۔ یہ جو ہماری آنکھ تھی، تمہاری طرح سُوج گئی ہے۔

جُمعہ کے دِن بعد نمازِ جمعہ قبرستان تشریف لے جاتے تو عصر کی نماز پہلے چھوٹی مسجد میں اُدا فرما کر مجلسِ احباب سے فرماتے۔ مسجد تیار ہوگئی۔ تو ایک دو جمعۃ الوداع یہاں بھی پڑھے گئے۔

ایک واقعہ: اِسی مسجد میں جمعہ کے روز بعد نمازِ عصر آپ مجلس کے ہمراہ دربار لگائے ہوئے تھے اتفاقاً حکیم محمد عظیم صاحب جو آپ کے نہایت مخلص تھے، اور کتب خانہ کی جلد سازی کی خدمت اُدا کیا کرتے تھے۔ اور عموماً عرسوں پر ایک ماہ قیام کر کے آمدہ کتب کی جلد بندی کرتے۔ بے اختیار عرض گذار ہوئے، کہ آپ کی نظرِ التفات تو ہم بے کسوں پر ابھی تک نہیں۔ کیا ہم اَب کوئی دوسرا تلاش کریں۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ آپ جوش میں آگئے۔ فرمایا کہ نامردوں کی عورتیں باہر جایا کرتی ہیں۔ بھلا دیکھو تو سہی۔ بس کیا تھا۔ سناٹا چھا گیا اور حکیم صاحب اپنے کئے پر سخت پریشان ہوئے۔

دُوسرا واقعہ: ایک دُوسرا واقعہ حکیم صاحب کا سن لیجئے۔ عام طور پر بعض زمینداروں کو اپنے زمینداری گھمنڈ کی وجہ سے بعض علماء سے کشمکش ہوتی ہے۔ اور چھیڑ چھاڑ رکھتے ہیں حکیم صاحب کی طبیعت تیز تھی۔ حکیم صاحب کی مسجد میں توت تھا۔ زمیندار اپنی زمینداری پر تھا۔ کہ میں اس توت کو کاٹنا چاہتا ہوں۔ اِس پر حکیم صاحب نے حضرت کی خدمت میں فریاد نامہ بھیج دیا۔ فوراً جواب

Marfat.com

لِکھا۔ جو مسجد کا توُت کاٹتا ہے، وُہ اپنی رگِ حیات کاٹتا ہے۔ اُس زمیندار نے توُت کاٹ دیا۔ لیکن وُہ بھی دُوسرے تیسرے دِن مر گیا۔ ہمارے حضرت رحمۃ اللہ علیہ غیرت مند تھے کِسی کی دھونس برداشت نہ فرماتے۔

باب ششم

خلقُ اللہ

اہل اللہ، خلق اللہ کو عیال اللہ خیال کرتے چلے آئے ہیں۔ اور اہل دِل جمالِ الٰہی کا پرتو اور عکس ہوتے ہیں۔ اور اہلِ علم یعنی علمائے کرام جلالِ الٰہی کا نمونہ ہوتے ہیں۔ اہلِ دِل سراسر رحم ہوتے ہیں۔ اور گنہ گار کا سہارا ہوتے ہیں۔ اور کوئی کتنا ہی گناہ گار حاضر ہو، اس پر رحم کی نظر ہوتی ہے۔ جیسے خود ذات عزّ اسمہٗ کی اپنی شفقتِ عامہ خَلق پر ہے۔ اور ہر گناہ گار دامنِ عاطفت میں پرورش پا رہے ہیں۔ یہی حال اولیائے کرام کا تھا۔ بخلاف اہلِ علم کے کہ وہ سراسر عدالت ہوتے ہیں۔ اور جلالِ الٰہی کی طرح برس رہے ہوتے ہیں اپنے پرائے سے بیگانے ہو کر دین کی خدمت بجالاتے ہیں۔ اور ہر گناہ کو فعلِ انسانی خیال کرتے ہوئے دھتکارتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اہل اللہ اور اہلِ طریقت کی خدمت میں ہر کس و ناکس حاضر ہو رہا ہے۔ اور حاضران کو اپنا شفیق و مہربان خیال کرتا ہے۔ اور اپنے مرض کا دوا اور اپنے گناہوں کی بخشش تصوّر کرتا اور یحق ہے بھی ایسے ہی۔ جب کوئی جاتا رحمت ہی رحمت نظر آتی۔ سرزنش کی جگہ گلے لگاتے۔ ٹوکنے کی جگہ ارشاداتِ عالیہ سے سرفراز فرماتے اور شیریں زبانی سے رحمتِ عامہ کے قصّے کہانیاں الٰہ العالمین اور رحمۃ للعالمین کے سناتے ہیں۔

غرض پریشانی کے عالم میں حاضر ہونے والے کے لیے سراسر طمانیّت ہوجاتے۔ بخلاف علمائے کرام کے ضروری ہدایات اور واجبی بات کے سوا کچھ کہنا سُننا پسند نہیں۔ اپنے طلباء کے ساتھ بھی اِتنا شغف نہیں، جتنا ایک ولی اللہ کو اپنے ایک عام مُرید کے ساتھ۔ غرض نگاہِ التفات بہت کم ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہل اللہ کی خِدمت میں خلقِ خدا دوڑی دوڑی جاتی ہے اور علمائے کرام کے پاس وہی جاتے ہیں، جن کا علاج کسی دُوسری جگہ نہیں ملتا۔ یعنی طلباء، یا ہم جنس علم والے۔ یا وہ جس نے فتویٰ لینا ہو۔ اور بس۔ لیکن اہلِ طریقت کے پاس شاہ و گدا یکساں اپنی نیاز مندیوں کو لے کر حاضر ہوتے ہیں۔ اور جو بھی جاتا ہے۔ ایک تسکین، ایک طمانیت لے کر آتا

ہے۔ مثلاً ایک آدمی کی بھینس مر جاتی ہے۔ پریشانی کے عالم میں حاضر ہوتا ہے اور اپنی تکلیف بیان کرتا ہے۔ وہ بس اتنا ہی فرما دیتے۔ "میاں! اللہ تعالےٰ کی حکمت۔ اسی میں بہتری ہوگی"۔ بس اتنے الفاظ سے اس کی طمانیت ہو جاتی۔ اور خوشی خوشی گھر آ جاتا۔ پھر ہوتا بھی کیا؟ کچھ دنوں کے بعد راز کھل جاتا ہے اور خود کہنے لگتا ہے کہ اللہ تعالےٰ کے تمام کام حکمت سے پُر ہیں۔

اکلوتا بیٹا مرتا ہے۔ باپ کو کوئی جگہ اپنے دُکھ کی نہیں ملتی۔ آخر ہر طرف سے مایوس ہو کر دروازۂ رحمت کو جا کھٹکھٹاتا ہے۔ جواب ملتا۔ کوئی فکر نہ کرو۔ اِس کے بدلے بہشت میں جگہ تمہیں ملے گی۔ حدیث پاک میں آتا ہے، یا فرما دیا جاتا۔ نِعمُ البَدَل آنے والا ہے۔ خدا کا کرنا۔ بچہ پیدا ہوتا اور عمر دراز پاتا ہے۔

بعض علماء اُن کی اس روشِ محبت کو ٹوکتے ہیں۔ اور فرما دیتے۔ دیکھو، یہ گناہ گاروں کے ملجا و ماویٰ ہیں۔ ہر برائی کے مددگار۔ قاتلوں کے دُعاگو۔ کفار کے ساتھ رہنے والوں کے لئے دعائیں۔ لیکن ان کو کیا معلوم۔ جس کام کے لئے وہ بنائے گئے۔ وہ کام اپنا کیسے چھوڑ سکتے ہیں۔ علماء جس خدمت کے لئے بنائے گئے۔ وہ اگر چھوڑ دیں تو دین ایک مذاق ہو نکلے گا۔

واقعہ: سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری مرحوم کا جب طوطی بولتا تھا۔ تو آپ کے وعظ اور تقریریں پہلا وار حکومت پر ہوتا تھا۔ پھر رؤساء اور اُمراء پر برستے تھے۔ اس کے بعد طریقت کو کوستے تھے۔ عجب انداز تھا۔ دِلوں میں بیٹھتا جاتا تھا۔ اور ہر سُننے والا متاثر ہوتا تھا۔ ایک بار ہمارے علاقہ میں وعظ فرمایا۔ اہلِ طریقت پر برسے اور خوب برسے۔ ایک متاثر آیا اور کہا، آج شاہ صاحب نے خوب فرمایا۔ یہ طریقت والے قاتلوں کے دُعاگو ہوتے ہیں۔ یہ قتلوں کے مُمد ہوتے ہیں۔ یہ حکومت کے ساتھ ہوتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

مَیں نے کہا، فقراء اور صلحاء کچھ نہیں کرتے۔ وہ تو صرف معافی اور استغفار پڑھنے کا طریقہ بتلاتے ہیں اور معافیٔ گناہ کے لئے دربارِ الٰہی حاضری کا حکم دیتے ہیں۔ کیا منع ہے؟ یا غیر شرع امر ہے؟ باقی رہی قاتلوں کی نجات اور خلاصی۔ اِس میں ان کا کیا دخل۔ یا خود رَبُّ العَالَمِین کا دخل ہے۔ وہ ان کو معاف کر کے خلاصی بخشتا ہے یا عدالت کا، جو اُن کو چھوڑتی

ہے۔ فقرا تو صرف عجز و نیاز کے طریقہ کا ارشاد فرماتے۔ اس کا کیا تھا۔ بات سمجھ گیا۔ یہ ایک سید صاحب موصوف کی ذات نہیں۔ ہر ذی علم بیچارہ اس خفقان کو دہراتا رہتا۔ تاکہ ان کی مقبولیت عام کم ہو۔ لیکن ؎

چراغ را کہ ایزد بر فروزد
ہر آں کہ تف زند ایشش بزوزد

ان کی رحمت و محبت کی وجہ سے خلق اللہ ان پر قربان ہوتی ہے اور ان کی عظمت اور جلال کی وجہ سے خلق ان سے محروم رہتی ہے۔ دیکھئے ہر آدمی اپنی غرض اور حاجت کے لئے حاضر ہوتا لیکن اس جانب سے لنگر حاضر ہے۔ اور ہر آنے والے کے لئے کچھ بوجھ نہیں۔ روٹی، بستر حاضر ہر طرح کے آرام و آسائش موجود۔ اور سب سے بڑھ کر شفقت بھری نگاہ اور عین پرتو الٰہی ؎

نہ کہیں جہاں میں پناہ ملی، جو پناہ ملی تو کہاں ملی
میرے جرم ہائے سیاہ کو تیرے عفوِ بندہ نواز میں

لنگر کی وسعت کا کیا کہنا۔ عین نظرِ الٰہی کی وسعت کا خاکہ تھا: ؎

ادیم زمیں سفرۂ عام اوست
بر آں خواں یغما چہ دشمن چہ دوست

ہر حاجت طلب کیلئے مشفقانہ کلمات و دعا۔ ہر زائر کے لئے محبت بھرے جام وسبُو۔ ہر سیاہ کار کے لئے مغفرت۔ اور پہاڑ کی استقامت میں بیٹھے نظر آتے ہیں۔ پریشانی نہیں۔ سکون و طمانیت سے بھرے بھرے نظر آتے ہیں۔ صرف دیکھنے سے ٹھنڈک، آنکھ اور کلیجہ کو ٹھنڈا کر دیتی ہے۔ بولنے کی ضرورت نہیں۔ نگاہ مست اور خمارِ آنکھ ہی سر فروشان کو ٹے پار کیلئے کافی وافی

اِنفاق فی سبیلِ اللہ: راہ مولا میں خرچ کرنے کے لاکھوں طریقے ہیں اور ہر طریقہ پسندیدہ۔ لیکن ہمارے نزدیک سب سے اعلٰے وارفع یہ طریقہ کہ مخلوق بہر رنگ فکر کی، فائدہ اٹھائے۔ مدرسہ خانقاہ کی صورت اور خانقاہ مدرسہ کی سیرت میں ہو۔ اور علوم دینیہ کی حقیقی آبیاری ہو رہی ہو۔ علم طریقت سے جدا نہیں اور نہ طریقت علم سے الگ۔ ایک دوسرے سے بغل گیر۔ حرف گیری کی گنجائش نہیں۔ پھر صرف علم تربیت والوں کا حصہ نہیں۔ ہر کہ ومہ کے لئے در کشادہ ہے۔ ہر آدمی یکساں امیدوار۔

Marfat.com

۱؎ ہر آنکہ بر درِ تو رسید، مطلب یافت
رو ا مدار کہ من نامراد بر گردم

۲؎ ہر کہ آمد بر درت اُمیدوار
شاہد مقصود یابد در کنار

حضرت قبلہ کا لنگر اِسی قسم کا تھا۔ ایک طرف طلباء اور سالکینِ راہِ ہدایت کھانا کھا رہے ہیں اور دُوسری طرف محتاج و بے دست و پا بھی اپنا پیٹ بھر رہے ہیں۔ یہ تو ظاہر تھا باطناً دنیا کے راندے، اُعداء کے مارے، جنکو پناہ نہ ملتی تھی، حاضر ہوتے۔ صرف ایک نگاہ سے کایا پلٹ جاتی تھی۔

سُنا ہے سردار شیر خان مغفور و مرحوم سے برادر الگ ہو گئے، کیونکہ دُو ماں کے بیٹے تھے جب وُہ اپنی جائیداد سے نااُمید ہو گئے، تو حضرت کی خِدمت میں آئے۔ حضرت نے تسلی دی اور وہ سب کچُھ مِل گیا جو وہ چاہتے تھے۔ رئیس تھے۔ لیکن وہ ایک درویش ہو کر عمر بھر رہے۔ مجُھے یاد ہے۔ جب مَیں حضرت کے ہمراہ کوٹ بھائیخان گیا۔ میں بچہ تھا۔ مجھے بلوایا۔ اپنی گود میں بٹھایا۔ پیار کر رہے تھے کہ اتنے میں ایک سیال (قوم) چک موسیٰ سے آئے اور بیٹھے اور کہنے لگے۔ تم طعنے دیتے ہو کہ اپنا پیر خانہ چھوڑ گئے (سردار صاحب کے آباء و اجداد میاں موسیٰ صاحب کے مرید تھے)۔ تم اگر ان کے طریقہ پر ہوتے، تمہیں بھی کچھ ملتا تو ہم کیوں دوسری جگہ جاتے۔

سردار صاحب مرحوم ان مخلصین سے تھے، جو خود بخود لنگر کا خیال رکھتے تھے۔ اور احمد بخش خوجہ لانگری سے دریافت کرتے رہتے تھے کہ کِسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟ جب وہ حال سُناتے تھے خود بخود لنگر میں غلّہ ہر قسم کا بھیج دیتے۔

جَب سرکاری نالے آبپاشی بنجر کے لیئے آئے۔ مغربی نالہ پر، بیربل کی زمین کے متّصل، ایک بہت بڑا قطعۂ زمین چارہ کیلیئے دے دیا۔ اور کچھ حِصّہ جو حاجی فتح خان صاحب کہلاتے تھے۔ وُہ تین بھائی تھے، انہوں نے دیا۔ قریباً ستّر اسّی بگھہ تھا۔ جو آج تک اِسی لنگر کا شمار ہوتا ہے۔ اُور بعد میں سردار صاحب خان صاحب مرحوم نے حضرات کے نام انتقال کرا کر ہمیشہ کیلیئے وقفِ خدمتِ حضرات کر دیا۔

Marfat.com

سیّد نجف شاہ صاحب رئیسِ شاہ پور بقدر خرچیلے آدمی تھے۔ قرضہ زیادہ ہوگیا۔ لگان تک ادا ہونا مشکل ہوگیا۔ ڈپٹی کمشنر انگریز تھا۔ جب ادائیگی کئی سال متواتر نہ ہوسکی، تو آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور عرض کیا۔ اب تو صاحب ذیلداری لیتا ہے اور کسی صورت باز نہیں آتا۔ آپ جب حیرت میں آجاتے تھے تو اکثر فرمایا کرتے تھے۔ ہاں۔ اس کے بعد تھوڑی دیر فرمایا۔ کوئی خوف نہیں۔ یہ نمبرداری ہمیشہ اور ذیلداری تمہارے نام لکھ دی گئی جاؤ۔

صاحب بدل گیا۔ اور صاحب آیا۔ جس کو شاہ صاحب پر رحم آگیا۔ اتنے میں بندوبست شروع ہوا۔ ان کے پہلے افسر بندوبست لی صاحب، جو ایک غیر معمولی ذہانت کا مالک تھا۔ پیش پیش اُس کی خدمت میں رہتے تھے۔ پانچ مربعہ رؤسا کے درجہ کی دیدی اور شاہ صاحب کے دن بدل گئے لیکن قدرتِ خدا شاہ صاحب کے اکیلے بیٹے انہیں دنوں فوت ہوگئے۔ جائیداد تھی۔ اس وقت عمر چھیاسٹھ ۶۶ سے زائد تھی۔ زیادہ ضعیف ہوگئے۔ غالباً چارپائی پر حاضر بیربل ہوئے۔ حضرت کے روضہ پر آپ کا فاتحہ پڑھا۔ دعا مانگی۔ خدا تعالےٰ سے بہتری مانگی۔ اور نکاح کیا۔ تین لڑکے اللہ تعالیٰ نے عنایت فرمائے۔ ہر سہ صاحبزادگان کی خدمت میں نذرانے پیش کئے۔

سینکڑوں واقعات ایسے ہیں، جو حضرتِ اقدس رح کی توجہ سے آناً فاناً پورے ہوگئے اور حالات بدل گئے۔ اصول یہ ہے کہ قوتِ باطنی کا مرکز سینہ و دل ہے۔ جس پر انوارِ الہٰیہ کا نزول ہر آن ہوتا رہتا ہے۔ اور یہ سینہ اور یہ دل جس طرح کے سامان پیدا ہوئے، اُسی طرف اُلٹ جاتے ہیں جس طرف اور جس طرح اُن کا الٹا ہو جانا، قدرتِ الہٰیہ یا فطرتِ الہٰیہ کا میلان اُسی جانب خود بدلتا رہتا ہے اگر شفقت پیدا ہوگئی۔ اور سینہ شفقت و محبت سے بھر گیا، تو فطرتِ الہٰیہ کا عکس اسی شفقت میں تبدیل ہوگیا۔ یعنی خوف اور قدرتِ الہٰیہ دل کے اندر آکر دل کا رنگ لے لیتی ہے۔ اگر دل شفقت بھرا ہے، تو شفقت و رحمت ہوکر ظہور کرے گی۔ اور اگر غضب و غصّہ سے بھرا ہے، تو قدرت غضب و غصّہ کے حال میں ظہور میں آئے گی۔ اور سینہ و دل میں جلال پیدا ہوگیا۔ اور کسی کے اطوار حکم سے دل و سینہ میں اُبھر گئے۔ البتہ دل کے تمام عکوس فوری طور جلال و غضب میں بدل گئے۔ اور فطرت اللہ کا عکس بھی اسی رنگ غضبِ دل کے عکس کا رنگ لے کر سراسر غضبِ الہٰیہ کا رنگ لے کر آتش فشاں ہو گئے۔

یاد رہے کوئی خاص خیال اور کوئی خاص نظر سامنے نہیں ہوتی۔ صرف جلال وجمال کے پرتو اپنے ظہور فطرتی پر ظاہر ہوتے ہیں۔ اور البتہ معکوس کی استعداد کے مطابق ڈھلتے جاتے ہیں۔

لنگر: لنگر کو طریقت کے ساتھ فطرتی مناسبت ہے۔ اور صاحبِ طریقت کی ابتدا اسی لنگر سے ہوتی ہے۔ اور انتہاء بھی لنگر پر ہوتی ہے۔ صاحبِ طریقت کا جتنا حوصلہ ہے۔ اسی کے مطابق لنگر چلتے ہیں۔ ویسے صاحبِ لنگر کا تعلق ذاتی لنگر کے ساتھ کچھ نہیں ہوتا۔ وہ خود اپنا لنگر نہیں سمجھتا بلکہ خدائی لنگر خیال کرتا ہے۔ ایسے ہی لنگر کے خدمت گار بھی لنگر کی خدمت کو صاحبِ طریقت یا لنگر والے کی خدمت کبھی تصوّر نہیں کرتے۔ بلکہ خدائی دسترخوان خیال کرتے۔ اپنی نسبت سے پاک ہوتے ہیں۔ جاہل سے جاہل اور عالم سے عالم، مفلس سے مفلس اور غنی سے غنی، ہر ایک اس خیال میں مساوی۔ کسی کو اس کے لینے دینے اور کھانے پینے میں رشک نہیں۔ لاکھوں روپے لنگر میں دینے والا کبھی اپنے اندر یہ احساس نہیں پاتا کہ میں کوئی خاص خدمت کر رہا ہوں۔ یا میرا کوئی خاص حق کھانے پینے کا ہے۔ یا مجھے کوئی خاص مشورہ لنگر کے بارے دینا ضروری ہے، یا دے سکتا ہے نہیں، ہرگز نہیں۔ یہ تو چلتا ہے، جیسے چلتا ہے۔ اور یہ نمونہ اور عکس جمالی ذاتِ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ کی شفقت وعنایت۔ اور دعائے خلیل کا نتیجہ ہے۔ وَاجْعَلْ أَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِي إِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُم مِّنَ الثَّمَرَاتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُونَ۔

عوام وخواص کے دل خود ان کی طرف پھرتے ہیں۔ اور خود بخود رزق ان کو پہنچتا ہے کیوں، صرف اس لئے کہ وہ شکر گزار ثابت ہوں۔ فقراء اس صورت میں بیٹھے نظر آتے ہیں اور ہر گھڑی، ہر آن شکر گزاری کے سوا کوئی کام نہیں۔ گو ظاہراً آپ کو شکر گزار الفاظ میں نظر نہ آتے ہوں لیکن قلبی طور پر شکر گزاری سے وقت گذرتا ہے۔

جب کوئی لنگر میں حاضر ہوتا ہے تو کبھی اس کے خیال میں یہ نہیں کہ مجھے کیسی روٹی ملے گی۔ اور نہ صاحبِ لنگر کو خیال آتا ہے کہ ایسی روٹی فلاں کو پیش کی جائے۔ بلکہ میزبان اور مہمان اس حال متفق ہیں۔ مطلق کوئی احساس منّت واحتیاج کا پیدا نہیں ہوتا۔

ویسے ہر میزبان اور مہمان ہر جگہ اس احساس سے خالی نہیں ہوتا۔ آنے والے کے دل میں بھی۔ کھانا کھلانے والے کے دل میں بھی، یہ احساس موجود رہتا ہے کہ مہمان ہے۔ کچھ خاص اس

کے لئے ضروری ہے۔ اور مہمان کے دل میں ضرور آجاتا ہے، میری خدمتِ مہمانی کیلئے کرتے ہیں
یہی وجہ ہے کہ لنگر خدائی رزق خیال کیا جاتا ہے۔ اور خدائی دسترخوان۔ نہ کھانے والے کو تکلیف نہ
کھلانے والے کو تکلیف۔ گویا ہر کھانے والا حاضر اپنے گھر سے کھا رہا ہے۔

مَیں ہمیشہ احباب کو کہتا ہوں کہ لنگر کی روٹی کھایا کرو۔ نہ ہمیں کوئی تکلیف کہ خیال
میں ہو کہ کچھ ایسا ہو۔ نہ لنگر والوں کو تکلیف کہ ایسے کھانا دیا جائے۔

بہر صورت لنگر دسترخوانِ الٰہیّہ ہوتا ہے۔ اِس کے خدمت گزار بھی اِس احساس سے
پاک، کہ کیا دیا جائے، کتنا دیا جائے، کیسے دیا جائے۔ جو مل گیا، وہی حاضر۔ تھوڑا ہو کہ بہت ہو اچھا
ہو کہ ناقص۔ غرض جو آسانی سے میسر ہے، وہی حاضر کیا جاتا۔ ایک انڈا سے لے کر گائے بھینس تک
ایک صف میں کھڑے نظر آتے ہیں۔ اور پھر کوئی فخر نہیں کہ مَیں یہ دے رہا ہوں، اور تو یہ دے
رہا ہے۔ بلکہ اِس احساس سے جانبین پاک۔ کم و کیف سے پاک کتنا دیا اور کیسے دیا۔

پھر جُوں جوں خلوص و اخلاص بڑھتا ہے، توں توں لنگر بڑھتا ہے۔ بعض حضرات
کے لنگر اتنے وسیع تھے کہ سینکڑوں نہیں، ہزاروں کی تعداد میں حاضرین شامل ہوتے تھے۔ اور شاہ
و گدا بھی اپنی اپنی ضرورت کے مطابق کھانا کھاتے تھے۔ اور حسد تک نہ تھا۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ
رحمتہ اللہ علیہ کا لنگر شریف کتنا وسیع تھا۔ سینکڑوں سے بڑھ کر ہزاروں تک نوبت پہنچ گئی تھی
ایک لطیفہ یاد آگیا۔

ایک لطیفہ: اگرچہ اس کا تعلق یہاں نہیں ہے۔ لیکن حضرت نظام الدین رحمتہ اللہ علیہ کی وسعت
کے ساتھ خود بخود یاد آگیا۔ جو لطف سے خالی نہیں۔

حضرت نظام الدین محبوبِ الٰہی رحمتہ اللہ علیہ نے حضرت فرید گنج شکر رحمتہ اللہ
علیہ کے عُرس پر بڑے اہتمام سے بہت سا کھانا تیار کرایا۔ جو حاضرین کی تعداد کے مطابق ہزاروں
کے لئے تھا۔ جب کھانا تیار ہو گیا۔ اور شام کے بعد منتظمِ اعلیٰ لنگر نے حاضر ہو کر عرض کیا۔ کھانا تیار
ہے۔ فاتحہ دلایا جائے۔ اور تقسیم کا حکم دیا جائے۔ تو فاتحہ کے بعد حضرت مراقبہ میں چلے گئے۔ یہاں
تک کہ تیسرا حصہ رات رہ گیا۔ اور سحری کا وقت ہو گیا۔ اس وقت آپ نے سر اُٹھایا۔ اور حکم
دیا کہ لنگر تقسیم کیا جاوے۔ لنگر گزار نے عرض کیا۔ کھانا تو برباد ہو گیا۔ رات گزر گئی۔ فرمایا۔ میں کیا

کرتا۔ تمام حضرات کے اَرواح مبارک کلیر بھائی صابرؒ کے پاس گئے ہوئے بیٹھے۔ اور جب وہاں سے فراغت ہوئی تو اجازت مِلی۔ لانگری نے عرض کیا۔ کیا پکا تھا۔ فرمایا۔ پانچ روٹی۔ وُہ بھی موٹھ وغیرہ کی۔ عرض کی گئی۔ اس پر یہ اہتمام۔ فرمایا۔ وُہ روٹیاں پانچ اس تمام پلاؤ زردہ سے حضرات کے خوشی میں بڑھ گئیں۔ ان کی ایک روٹی کے برابر ہمارے تمام لنگر کی قیمت نہیں۔ بھائی قیمت ان کے گھر کی ہے جن کا مال ہے۔ وَرنہ دنیا داروں کی آنکھوں میں زرق برق ہے۔ بھوک پیاس کی کوئی قیمت نہیں۔

غرض لنگر کی قیمت اشیاء کی قیمت پر نہیں ہوتی۔ بلکہ اخلاص و محبّت کی قیمت ہوتی ہے۔ فرمایا گیا۔ حدیث کہ "غریب کے جَو کے برابر کا صدقہ اُحُد پہاڑ سونے کے برابر کا ہے۔ اَللّٰہُ اَکْبَر۔ کیونکہ غریب کا اِخلاص اُمیر کے اخلاص سے سینکڑوں گنا بڑا ہوتا ہے۔

ہمارے حضرت کا لنگر: ہمارے حضرت کا لنگر بھی گو خانقاہ کے مطابق وسیع تھا۔ لیکن دولتمند نہ تھا۔ کفاف پر تھا۔ ایک طرف آتا۔ ایک طرف جاتا۔ اور نہایت سادہ تھا۔ گندم کی روٹی رات کو اور دال ہوتی تھی۔ گاہ چنا، گاہ مسوُر۔ گاہ گاہ کچھ اور بھی پکتا، جب کچھ اور آجاتا۔ ساگ، شلغم بھی سردیوں میں پکتے تھے۔ صبح سادہ روٹی اور چھاچھ یعنی لسّی "دو چمچہ آب است و یک چمچہ دوغ" والا معاملہ ہوتا تھا۔ کبھی اس سے بڑھ جاتا تھا۔

کوئی امیر یا کوئی مخلص آجاتا، تو لانگری احمد بخش مرحوم گھی سے روٹی چوپڑ دیتا تھا۔ جو وہاں ایک ڈولی میں رکھا رہتا تھا۔ جیسے حضور رحمۃ اللہ علیہ ڈیڑھ ہفتہ کے بعد عنایت فرمایا کرتے تھے۔ اور گاہ چند بتاشے یا کچھ ایک ڈلی اچار آنبہ رکھ دی جاتی تھی۔ اور یہی بہت بڑی مہمانی لنگر ہوتی تھی۔

لانگری احمد بخش: میاں احمد بخش حضرت قبلہ کا لانگری نہایت فہیم و عقیل انسان تھا۔ لنگر کے تمام امور کو خود بخود سر انجام دیتا ہے۔ یعنی غلّہ کا مہیا کرنا، پسوانا وغیرہ۔ عام طور پر سالن تو مقرّرہ وزن پر ملتا تھا۔ غالباً آدھ سیر، بارہ چھٹانک دال ایک بڑے دیگچہ میں پکتی تھی۔ جو اسّی نوّے کے لئے کافی ہو جاتی تھی۔ اور مزیدار ہوتی تھی۔ عام طور پر مشہور ہے، کہ لنگر کا کھانا لُطف دار اور مزیدار ہوتا ہے۔ بحق ہے بھی بات یہ۔ ایک شاہد نہیں بلکہ جس نے اُسے کھایا چکھا، وہی اِس بات کو تسلیم کرتا چلا آیا۔ اپنا خیال تو یہی ہے۔ جتنی عِلمیّت زیادہ ہوتی ہے،

اتنی برکت زیادہ ہوتی ہے۔ اور اتنی ہی ذوقیت زیادہ ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ لنگر کی سُوکھی باسی روٹی بھی مزے اور لطف سے خالی نہیں ہوتی۔

روٹیوں کی تعداد یہی بتلاتے تھے۔ ہر دو وقت آدمی بدلتے رہتے۔ اور بڑے سمجھ کے آدمی تھے۔ قاضی صاحب نلی والے جو حضور کے خادم خاص اور آپ کے خلیفہ بھی بعد میں بن گئے تھے۔ میاں احمد بخش کی ذہانت کو بیان کرتے تھے کہ ایک بار حضرت نے احمد بخش کو بلایا۔ آیا اور چلا گیا۔ پھر بلوایا۔ پھر چلا گیا۔ پھر حضرت نے بلوایا۔ پھر بولے اور دریافت کئے بغیر پہلے کی طرح چلا گیا۔ تین بار حاضر ہوا۔ لیکن دریافت کئے بغیر چلا گیا۔ اور بعد میں حیران رہ گیا۔ حضرتؒ بلواتے ہیں اور پھر کچھ نہیں فرماتے۔ اور وہ حاضر ہوتا ہے۔ کچھ دریافت نہیں کرتا۔ آخر میں مَیں نے میاں احمد بخش مرحوم سے پوچھا۔ کیا بات ہے؟ تین بار تم کو بلوایا۔ اور تینوں بار حاضر ہو کر چلے آئے۔ جواب دیا۔ حسبِ حکم کام کرتا رہا۔

پہلی بار بلوایا تو ایک آدمی جو پاس بیٹھا تھا۔ اس کی روٹی کے لئے ارشاد فرمایا۔ دوسری بار بلوایا تو دوسرے آدمی کا اشارہ تھا۔ تیسری بار بلوایا تو آپ کا یہ مطلب تھا کہ مصلےٰ پر تاشے پڑے ہیں یہ لے جاؤ۔ اور مہمانوں کی روٹی کے ساتھ رکھو۔ حاضری جس امر کے لئے ہوتی تھی۔ میں سمجھ جاتا تھا۔ بولنے اور دریافت کی ضرورت نہ تھی۔

خدّامِ حضرتؒ: اکثر خدّامِ حضرتؒ مزاج شناسِ مردم ہوتے تھے۔ اپنے فرائض کی انجام دہی کے لئے خصوصی امتیاز رکھتے تھے۔ ہمارے خواجہ احمد بخش جیسا آدمی کوئی لانگری ہماری نظر سے نہیں گزرا۔ لنگر کے کام کے سوا دوسرے امور کا نگران بھی تھا۔ اور ان کی کڑی نظر ہر درویش پر ہوتی تھی۔ اور اکثر طلباء اور ہمارے لانگری صاحب کی کشمکش رہا کرتی تھی۔

میرے اُستاد: حافظ پیر بخش صاحب جو طلباء میں داخل تھے اور بڑے تنہ زور تھے۔ اُن کی اور میاں احمد بخش کی ہمیشہ ٹکر رہتی تھی۔ عموماً ہر جگہ یہ مرض دیکھا ہے۔ کہ مدرسہ کے طلباء کی ناراضگی منتظمینِ مدرسہ سے رہی۔ چونکہ اُستاد الگ ہوتے ہیں۔ اور منتظمین الگ۔ یہ سلسلہ اکثر خاصہ فریقین میں چلتا رہتا ہے۔ اساتذہ ہمیشہ طلباء کا ساتھ دیتے ہیں۔ اور اعلیٰ منتظم ہمیشہ اپنے ماتحتوں کے ساتھ رہا کرتا ہے۔

مجھے حافظ صاحب نے قرآنِ حکیم حفظ کرایا۔ اور لاتعداد قرآن کے حافظ بھی کئے۔ وُہ خُود بڑے حافظ تھے۔ چھ گھنٹے میں قرآنِ حکیم، نہایت صاف لہجے میں رمضان شریف میں سُنایا کرتے تھے۔ میاں احمد بخش جہاں لنگر کا خدمت گزار تھا۔ وہاں گاؤں والے بھی اِس سے اسٹامپ لکھایا کرتے تھے۔ اور وہ وقت مُسلمان کی غربت کا تھا۔ عام غریبی تھی۔ اور قرضے سُودی لیا کرتے تھے پَیسہ اور لالچ بڑی چیز ہے۔ اِس لئے اسٹامپ نَویس اکثر بندوں کے دھڑے کے ہو جاتے تھے۔ اور جیسے کہتے تھے، لکھ دیتے تھے۔ اور جیسے وُہ سُود کی سودا بازی چاہتے تھے۔ یہ کر دیتے۔ اِس لئے عام تاثر میاں احمد بخش صاحب کے برخلاف رہتا تھا۔

ایک بار ایک سادہ آدمی نے حضرت اقدسؒ کی خدمت میں عرض کر دیا کہ آپؒ نے یہ شیطان اپنے پاس کیوں رکھا ہوا ہے۔ یعنی میاں احمد بخش! حضرتؒ حاضر جواب تھے۔ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے بھی ایک شیطانِ رجیم رکھا ہوا ہے۔ ہم بھی اس کے بندے ہیں۔ اس کے اتباع میں ایک شیطونگڑہ یعنی چھوٹا شیطان ہم نے بھی رکھا ہوا ہے۔ لیکن اس وقت بات سمجھ میں نہ آئی۔ آج سمجھ میں آیا کہ دُنیا شیطان سے ہی چلتی ہے اور شیطان ہی دنیا کے دَل چَل جاتا ہے جیسے کہ حضرت سلیمانؑ کا قصہ مشہور ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السّلام نے بارگاہِ الٰہی میں عرض کیا۔ جو کُچھ آپ نے پیدا کیا۔ سَب صحیح اور موزوں۔ لیکن شیطان الٰہ العالمین نے پیدا کیا۔ صرف انسان کو ورغلاتا رہتا ہے۔ اور شیطانی وسوسے ڈالتا رہتا ہے۔ اور آپ کے حکم کے برخلاف اُکساتا رہتا ہے۔

بارگاہِ الٰہی سے آواز آئی۔ اچھا تمہیں پسند نہیں تو ہم اس کو تمہاری قید میں ڈال دیتے ہیں۔ چنانچہ وُہ حضرتؑ کے پاس بٹھا دیا گیا۔ لیکن اس کا قید ہونا تھا کہ تمام رونقِ دنیا ختم ہو گئی۔ نہ بازاروں میں ہماہمی رہی اور نہ کوچوں میں روحِ زندگی نظر آئی۔ اور عدالتوں پر خاموشی چھا گئی۔ اور حاکم عدالتوں میں ہاتھوں پر ہاتھ دھرے نظر آتے۔

غرض دنیا کا تمام بازار سرد ہو گیا۔ اس کے ساتھ کوئی زنبیل بھی حضرت سلیمانؑ کی فروخت نہ ہوئی۔ جو بنا کر بیچا کرتے تھے۔ اور جن کی قیمت سے گذران کرتے تھے۔ ایک دِن بھی فاقہ میں گیا۔ دوسرا بھی اور تیسرا بھی جا رہا تھا۔ کہ حضرت ربُّ العزت کی بارگاہ میں عرض کیا۔ اب

Marfat.com

تو بھوک سے جان جا رہی ہے۔ کیا بے ادبی ہوئی۔ ایک زنبیل بھی فروخت نہیں ہوئی۔

جواب آیا کہ جو بیچنے کا ذریعہ تھا۔ وہ تم نے اپنے پاس قید کر رکھا ہے۔ اب زنبیلیں کیسے فروخت ہوں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کی نظر کھل گئی۔ اور سمجھ میں آ گیا۔ کہ یہ تمام کارخانہ اسی پرزہ سے چل رہا ہے جو شَیْطَانِ الرَّجِیْم کے نام سے مشہور ہے۔ بارگاہِ الٰہی سے معافی مانگی۔ اور اس کی رہائی کے لئے درخواست کی۔

اس کا نکلنا تھا کہ بازار میں رونق آ گئی اور چہل پہل شروع ہو گئی۔ یہ بات حقیقی ہو یا نہ لیکن بات صحیح ہے۔ جو رونقِ دُنیا ہے۔ وہ اس شیطانِ رجیم کی بدولت ہے۔ یہ فساد کراتا ہے۔

حضرتِ اقدس رح کی وفات کے بعد میاں احمد بخش مرحوم نیک ہو گئے تھے۔ ہر وقت تسبیح ہاتھ میں ہوتی تھی۔

ایک نسبت کا فرق: حضرتِ اعلےٰ رحمۃ اللہ علیہ کا خیال طریقت اور سلوک کی طرف بہت نہ تھا۔ ہر وقت تعلیم وتعلّم کی طرف توجہ رہتی تھی۔ غالباً خیال تھا کہ علم کسبی دولت ہے اور طریقت وہبی عنایت اگرچہ بہت سے لوگ سلسلہ بیعت میں داخل تھے۔ اور مغربی اضلاع پنجاب میں ان کا سلسلہ بہت پھیلا ہوا تھا۔ لیکن آپ اپنی محویت کے سوا کسی طرف توجہ نہ فرماتے تھے۔ اگر خیال ہوتا تو درس تدریس کی طرف اپنی اولاد پڑھنے دیکھنا پسند کرتے تھے۔ جلوت میں بیٹھنا ہرگز پسند نہ تھا۔ جو حلقۂ درس میں آتے یا خدام لنگر یا زائرین جتنے بھی آتے، ہمیشہ آپ اُن سے لاپرواہ رہتے۔ آپ اکثر الگ رہا کرتے تھے۔ اور صرف ایک خادم ضروری پاس رہا کرتا تھا۔

وظائف: ذطائف بھی بہت معمولی بتلایا کرتے۔ وُہ بھی اپنی زبانی نہیں۔ بلکہ یہ خدمت بھی مولوی شاہ عالم صاحب کے سپرد تھی۔ آپ کے پاس جب کوئی بیعت کے لئے حاضر ہوتا تو وُہ بھی کسی وسیلے کے ساتھ جس کے کہنے پر آپ بیعت فرما لیتے تھے۔ پھر حکم ہوتا کہ جاؤ میاں شاہ عالم کے پاس چھوڑ آؤ۔

میاں صاحب اُسے تلقین کرتے اور وظائف بتلاتے۔

وظائف: بہت معمولی ذطائف تھے۔ صبح ۳۰۰ بار اللّٰہ اللّٰہ۔ پھر نماز کے بعد ۱۰۰ بار استغفار أَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ رَبِّیْ مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَّأَتُوْبُ إِلَیْہِ۔ بعد شام یَا شَیْخ عَبْدُ الْقَادِرِ جِیْلَانِیْ شَیْئًا لِلّٰہِ

اَور بعد عشاء درود شریف ۲۵ بار بایں الفاظ:

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعِتْرَتِهٖ بِعَدَدِ کُلِّ مَعْلُوْمٍ لَّکَ ۳۰ بار

اِس سے زائد کا عِلم کم ہے۔

لیکن اس نسبت کا کیا کہنا جس نے اُن سے بیعت کی، عمر بھر اُسے پھر پوچھا نہیں، کیا کرتے ہو؟ کیسے ہو؟ لیکن قدرتِ خُدا، جب آپ کے متوسلین کا وقتِ قرب آیا، وُہ یک بیک بدل گئے۔ اَور تمام امورِ دنیا سے دستبردار ہوکر واصلِ حق ہوئے۔ چہرہ مہرہ مسلمانوں کا لے کر رخصت ہوئے۔

چنانچہ میاں احمد بخش کی وفات بھی ایسے وقت ہوئی، جب وُہ زمرہ صالحین میں ہوگئے۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ۔

مَیں نے کسی بزرگ کے کسی سلسلہ میں اِتنے مختصر وظائف نہیں دیکھے لیکن اِتنا انجامِ بلند بھی کسی کے مُرید اور سالک کا نہیں دیکھا یقین جانئے سینکڑوں دیکھے۔ آخری صورت و سیرت کا نقشہ عین ایک مسلمان کا ہوگیا اَور وُہ کیفیات ان پر وارد ہو گئے، جو ایک سچّے مسلمان پر وارد ہوتے ہیں۔

مولوی شاہ عالم صاحبؒ:

مولوی شاہ عالم صاحب بچپنے میں تعلیم کے لئے آئے۔ اُصل جائے ضلع شاہپور کا تھا۔ کسی وجہ سے ان کے والد اپنے کسی رشتہ دار کے پاس بڈھ تحصیل شاہ پور میں مقیم ہوئے۔ ان کو درسِ قرآن میں داخلہ دلایا گیا۔ والدِ بزرگوار غالباً بڈھ میں فوت ہو گئے۔ آپ نے تمام تعلیم، قرآن حفظ کرنے کے بعد، حضرتؒ کے درس میں حاصل کی۔ اور فقہ میں نام پیدا کیا۔ تمام مسائل اور استفتاء کے وُہ مرکز تھے۔ زیادہ لکھ نہیں سکتے تھے۔ جیسا کہ اس زمانے کا رواج تھا، کہ عالم ہوکر حرف لکھنا مشکل تھا۔ تعلیم ہوتی تھی۔ لیکن تحریر و تقریر کی طرف توجہ نہ تھی۔ جتنے علماء اُس وقت تھے، بہت کم خوشخط اور تحریر میں صاف ہوتے تھے۔ بلکہ پڑھنے کے بعد حروف دیکھتے دیکھتے کچھ لکھ لیتے تھے۔

اپنا حال

میرا اپنا حال یہی ہے۔ خط کی ابتداء کچھ بھی نہیں ہوئی تھی۔ اور شرح ملّا تک ..... پڑھ گیا تھا۔ فارسی کتب متداولہ اچھّی طرح پڑھی تھیں۔ اور اشعار کثیر یاد تھیں۔ لیکن لکھنا نہیں جانتا تھا۔ لیکن جب میرے والدِ بزرگوار مسندِ ارشاد پر تشریف فرما ہوئے اور وہ اپنے مخلصین کی استدعا پر پہلے دورۂ گجرات، گوجرانوالہ تشریف لے گئے۔ تو میرے بھائی بھی آپ کے ہمراہ تھے۔ اس وقت ان کے خطوط کے جواب دینے کے لئے میں نے قلم دوات سنبھالا لیکن آج تک کمی ہے۔ بعض وقت ہجے غلط لکھے جاتے ہیں۔ اور وُہ تیزی پیدا نہیں ہوئی۔ جو ایک قلم برداشتہ تحریر کے لئے ہوتی ہے۔

بہرصُورت میاں شاہ عالم صاحب تحریر کے کند تھے۔ لیکن جزئیاتِ مسائل پر اتنا عبور تھا کہ شاید مفتی کفایت اللہ مرحوم کو ہو۔ کئی بار ہمارے قریب جھاوریاں میں مولانا محمد رفیق صاحب بھرتوی کے مسائل کو یا فتویٰ کو زبانی ٹوک دیتے تھے۔ اور مولانا کی دریافت پر کتاب پیش کر دیتے تھے۔ جس پر مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو اطمینان ہو جاتا۔

ایک بار مولانا محمد رفیق صاحب بیربل شریف تشریف لائے۔ نمازِ ظہر کا وقت تھا میاں صاحب باطمینان وضو کر رہے تھے۔ لیکن مولانا کو سخت پریشانی ہو رہی تھی۔ کہ وقت جا رہا ہے۔ وضو کر چکے تو مولانا نے کہا۔ وقت جا رہا ہے۔ میاں صاحب نے ہاتھ پکڑ لیا۔ اِستواء کی دھوپ گھڑی پر لے گئے۔ جہاں مثلِ اوّل و دوم کے نشانات لکیر سے بنا دیئے گئے اور پھر ان کو دو حصوں میں تقسیم کر کے، دُوسرے حصّہ کو بھی دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔

میاں صاحب نے کہا کہ ابھی تو سخت وقت میں بھی سایہ داخل نہیں ہوا۔ آپ کہتے ہیں وقت گزر رہا ہے۔ فرمایا کرتے تھے مثلِ اوّل کے نصف حصّہ کے بعد سخت وقت شروع ہوتا ہے۔ اور جب دُوسرے حصّہ کا نصف حصّہ گزر جائے، سخت وقت گزر جاتا ہے مولانا ان کی احتیاط دیکھ کر حیران رہ گئے۔

ان کے حجرے میں کتبِ فقہ کا انبار لگا رہتا تھا۔ اور دن بھر اسی شغل میں دن گزرتا تھا۔ حضور قبلہ کے حکم پر جواب میں یہ کتب پیش کرتے تھے۔ اور مولوی غلام کوٹ بھائیاں

والے جونہایت خوشخط تھے۔ عربی و فارسی تحریر میں نقل کر دیتے تھے۔ بعض وقت حضرت اقدس رحمتہ اللہ علیہ خود اپنی نوشت سے بھی جواب لکھتے تھے۔ آپ کا خط عربی تھا۔ اور عام تحریر پرانے دستور کے مطابق ٹیڑھے طریقہ پر لکھی جاتی۔ یعنی کونے سے شروع ہوتی تھی۔ سطریں سطحِ کاغذ کو کاٹتی جاتی تھیں۔

دُوسری خدمت: میاں صاحب کی دُوسری خدمت وقت کا نظم و نسق تھا۔ جو گھڑی حضرت کی خدمت پیش ہو کر آتی۔ وہ میاں صاحب کی خدمت میں بھیج دی جاتی تھی۔ اور میاں صاحب ہر وقت تمام کو چالو رکھتے تھے۔ اور صبح شام سورج کے ساتھ مقابلہ ہوتا تھا۔ دوپہر خطِ استواء پر سورج آتا، تب بھی مقابلہ کرتے تھے۔ غرض ایک منٹ کا فرق بھی نہیں آنے دیتے تھے۔

ختم خواجگان: ختمِ خواجگان دو وقت ہوتا، صبح و شام۔ صبح حضرت محمد اسلم رحؒ اور ایک اپنا تجویز کردہ پڑھا جاتا تھا۔ اور شام میں حضرت خواجگان نقشبندیہ کا پڑھا جاتا۔

خود حضرت رحؒ نہ پڑھتے۔ گاہ چار دانے لے کر ہاتھ میں رکھا کرتے تھے۔

ختم یا توجّہ میں کسی سے تعرض نہ تھا۔ کوئی درویش، کوئی صاحبزادہ شامل نہ ہوتا تھا۔ خدام کی اکثریت بھی اپنے مشاغل میں مصروف رہتی۔ گاہ گاہ میاں صاحب آپ کیلئے یہ خدمت انجام دیتے اور حضرتِ اقدس کو اس وقت دھیان آجاتا، جب میاں صاحب بلک کرتے۔

غرض طریقت کے ساتھ خاص لگاؤ نہ تھا۔ لگاؤ اور محبت علم کے ساتھ تھی۔

تیسری خدمت: شہر کے محتسب بھی تھے۔ اور یہی کچھ پوچھ گچھ ناموافق حرکات کی کیا کرتے تھے۔ اور شہر میں ان کا ہی فتویٰ چلتا تھا۔

چوتھی خدمت: بعض خصوصی بچوں کو قرآن شریف بھی حفظ کراتے تھے۔ ایک مختصر سا درس آپ کے سامنے بیٹھے رہا کرتا تھا۔ ایک طرف گھڑیاں ٹک ٹک کر رہی ہوتی تھیں۔ ایک طرف لڑکے قرآن شریف پڑھ رہے ہوتے۔ اور درمیان ایک مختصر صورت کے ساتھ بیٹھے نظر آتے نیچے مُصلّیٰ رکھتے تھے۔

پانچویں خدمت: ختم صبح و شام وہی پڑھایا کرتے تھے۔ اور ختم کی چادر اور دانے ان کے پاس رہا کرتے تھے۔ اور روزانہ حضرتِ اقدس رحمتہ اللہ علیہ کے جو مرید ہوتے تھے، ابتدائی تلقین کے بعد وظائف یہی سمجھایا کرتے تھے۔

معاوضہ: لیکن معاوضہ کیا تھا۔ صرف روٹی اور وُہ بھی سادہ۔ جو لنگر سے ملے۔ یا خوشنودیٔ حضرت اقدسؒ اور حضرت ربُّ العزت۔

قناعت: آپ کی تمام عمر قناعت پر گزری۔ کبھی کسی سے سوال نہ کیا۔ اور کبھی کسی دُوسری جگہ منتقلی کا خیال نہ آیا۔ "یک در گیر و محکم گیر" کا نمونہ تھے۔

والدہ مکرّمہ: اُن کی والدہ مکرمہ تھیں۔ اور وُہ ایک مدّت زندہ رہیں۔ نہایت پاک باز عورت تھیں۔ اور مجسمۂ طہارت تھیں۔ گرمیوں، سردیوں برابر نہا کر تہجد ادا فرماتی تھیں۔ اور اس حجرہ کے نیچے رہتی تھیں۔ جس پر اس کے بیٹے مولوی شاہ عالم رہتے تھے۔

میاں صاحب کی شادی بھی میاں عبداللہ صاحب مرحوم درویش مقیم آستانہ کی لڑکی سے ہوئی تھی۔ لیکن نبھاؤ نہ ہونے کی صورت میں علیحدگی اختیار کرلی گئی۔

ایک واقعہ: ایک دفعہ میاں شاہ عالم صاحب بہت سخت بیمار ہو گئے۔ اور لاچاری کے عالم ان کی والدہ صاحبہ نے حضرتِ اقدس کی خدمت میں حاضر ہو کر دُعا کی درخواست کی۔ آپ نے فرمایا۔ میاں شاہ عالم صاحب کی عمر تو ختم ہو چکی ہے۔ لیکن تمہاری اپنی عمر زیادہ ہے اگر تم اپنی عمر سے کچھ دے دو تو تمہارے لڑکے کی عمر بڑھ سکتی ہے۔ چنانچہ انہوں نے عرض کیا۔ مَیں اپنی تمام عمر دیتی ہوں۔ چنانچہ میاں صاحب تندرست ہو گئے۔ اور آخر ایک مدّت کے بعد والدہ کا انتقال ہو گیا۔ اور میاں صاحب اس وقت تک زندہ رہے۔ کہ میرے والد صاحب کی وفات ہو گئی۔ اور غالباً سنہ ۱۳۲۱ تک زندہ رہے۔ نَوَّرَ اللّٰہُ مَضْجَعَہٗ بیربل ہی میں حضرتؒ کے والدِ بزرگوار رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہ کے مغرب جانب میاں شاہ عالم کی قبر ہے۔

تیسرے خادم: میاں فضل دین صاحب سکنہ نور خانے والے ہیں۔ جنہوں نے اپنی تمام زندگی حضرتِ اقدسؒ کی خدمت میں گزار دی۔ جوانی میں آئے۔ اَن پڑھ تھے۔ حضرتؒ نے کسی سالک کو کہا کہ ان کو توجّہ دی جائے۔ جو معمولاتِ نقشبندیہ میں ابتدائی طالب کے لئے اکثر قلب چلانے کے لئے دی جاتی ہے۔ چنانچہ جب توجہ ہو چکی، تو حضرتؒ نے دریافت فرمایا۔ کچھ فضل دین کو اثر ہوا۔ عامل نے عرض کیا۔ جی ہاں، اُونگھ بھی آئی اور وُہ گرے بھی۔ اِتنے میں فضل دین بول اُٹھے۔ یہ کیا فائدہ ہے۔ یہ تو گادھی پر جب میں بیٹھتا تھا، اُونگھتا بھی تھا اور

Marfat.com

گرتا بھی تھا۔[1] لیکن یہ باوقار خادم اپنی سادگی میں رہے اور اپنی خدمت میں بلا تردّد اور پس و پیش اپنی خدمت چارہ لانے کی نبھاتے رہے۔ جب عمر زیادہ ہوگئی، تب بھی ایک آدمی اور خچر کو لے کر چلے جاتے تھے۔ اور یہ خدمت برابر دن بھر کرتے رہتے۔ لیکن کسی سے کوئی شکایت نہیں۔ حضرتؒ کی زندگی میں ان کی وفات ہوئی۔ اور وہیں دفن ہوئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

ایک عنایت: بعض وقت صاحبِ طریقت کو تنگیاں آجاتی ہیں۔ اور وہ مختلف ہوا کرتی ہیں۔ ایک آزمائشی ہوتی ہیں اور ایک فطرتی، یعنی فطرت اللہ کے مطابق، آزمائشی وقت پر دُور کی جاتی ہیں۔ اور فطرتی، ایک رحمت کا نمونہ ہوجاتی ہیں۔

مثلاً میرے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس کچھ عرصہ مویشیوں کا خدمتگزار کوئی نہ رہا۔ اور آپ کو سخت تکلیف ہو رہی تھی۔ یہ تکلیف کئی ماہ رہی۔ اگرچہ اس کے لئے باقاعدہ تو دُعا نہیں ہوتی۔ لیکن بے اختیار تنگی میں توجہ اِلیٰ اللہ ہوجاتی ہے۔ چنانچہ جب آپ کو یہ تکلیف زیادہ محسوس ہوتی تو خواب میں ایک آدمی دکھایا گیا۔ اور کہا، یہ آپ کی خدمت کیلئے چنانچہ جب صبح ہوئی، تو وہی آدمی آگیا۔ جسے حضرت نے پہچان لیا۔ قدرتِ خدا ایسے وفادار رہا کہ کسی کی باتوں میں نہ آیا۔ آخر وہیں خدمت گزاری میں فوت ہوا۔ اس شخص کا نام راجا تھا اور بھیرہ کے قریب کا رہنے والا تھا۔ پھر وُہ گھر نہیں گیا اور وہیں دفن ہوا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

ایسے ہی میاں فضل دین اللہ کے عنایت کردہ خادم تھے۔ پھر وُہ عمر بھر گھر نہیں گئے۔ حالانکہ آٹھ نو کوس پر ان کا گھر نور خانیوالا تھا۔

میاں کرم دین صاحبؒ: مولوی کرم دین صاحب آپ کے چوتھے ایسے خادم ہیں، جن کا ذکر ضروری ہے۔ وُہ بچپنے میں آئے۔ ختنہ بیربل میں حضرتِ اعلیٰ رحمۃ اللہ علیہ نے عمرِ بلوغت میں کرایا۔ یہ بچے تھے۔ اپنی پیشکاری میں انہیں حضرتؒ نے رکھا۔ ہر وقت حاضر رہتے تھے۔ چھوٹے کام مثلاً وضو کرانا، مصلّےٰ صاف کرنا۔ کسی کو بلانا۔ گھر میں کوئی پیغام کرنا۔ بیماری کی وجہ

---

[1] کنواں جب بیل جوت کر چلایا جاتا ہے، تو ان کو ہانکنے کے لئے آدمی پر بیٹھا جاتا ہے۔ تاکہ بیلوں کو ہوشیار رکھے اور بیل خیال کریں کہ ہمارے سر پر کوئی ہے۔

سے پاؤں کی پلیاں اکثر گھی، تیل سے مَلایا کرتے تھے۔ وُہ وقت نا وقت مُلنا۔ عموماً دوپہر کے قیلولہ کے وقت آپ کا معمول تھا۔ غرض حاضر باشی منصب پر تھا۔ بچّے تھے۔ گاہ گاہ حضرتؒ مذاق بھی کر لیا کرتے تھے۔ حالانکہ آپ نے عمر بھر کسی بالغ آدمی کے ساتھ کُھل کر بات بھی نہیں فرمائی۔ ہمیشہ خاموش فطرت رہی۔ اِس خدمت میں بیچارے وُہ کیا پڑھتے۔ گو حضرتؒ نے ضرور کسی کے حوالہ کیا ہوگا۔ لیکن بچے تھے۔ اِسی خدمت میں یاد دہانی میں وقت گزر گیا۔

آخر گھر سے بلاوا آیا۔ جن کے والدِ بزرگوار کی بیعت بھی حضرتِ اقدسؒ سے تھی۔ تو حضرتؒ نے اِجازت بخش دی اَور وہ گھر گئے۔ کوئی ختمِ قرآن کا موقعہ آگیا اس میں اس کو بھی لے گئے۔ لیکن انہوں نے پڑھا ہوتا تو پڑھتے۔ یہ خاموش بیٹھے ہیں۔ باپ نے کہا۔ تم بھی پڑھو۔ اب کیا تھا۔ خاموشی۔ آخر دوسرے تیسرے دن لے کر پھر وُہ حضرتِ اقدسؒ کی خِدمت میں حاضر ہوئے۔ عرض کیا کہ اُس نے تو کچھ بھی یہاں آپ کی خدمت میں نہیں پڑھا۔ آپ نے حسبِ انداز فرمایا۔ ہاں۔ پھر وُہ رخصت ہو کر گھر آ گئے اور حضرتؒ نے ان کو فرمایا۔ سورۂ دہر یاد کرو۔ چنانچہ سورۂ دہر پڑھا کر حضرتؒ نے دستار منگائی اور سَر پر باندھی، اور رخصت فرما دیا۔ پھر گھر میں آیا۔ تو ان کے والد حیران رہ گئے۔ لیکن پھر جس موقع پر جاتے۔ یہ سورۂ دہر پڑھ کر میدان فتح کر جاتے۔ اور موقع پر مبارک ملتی۔ اصل سرمایۂ عِلمی تو یہی سورۂ دہر کی حفظ اور بس۔ لیکن اس کے بعد پڑھنے لکھنے لگ گئے۔ شعر بھی پنجابی کہتے ہیں۔ لیکن جہاں جاتے ہیں، مجلس کا سہرہ بن جاتے ہیں۔ وَیسے ملنے ملانے اور خدمت گزاری کے کامل مردم شناس ثابت ہوئے۔

چند سال کے بعد حضرتؒ سے رُخصت ہوگئے۔ اَور گھر میں مختلف مواضعات میں اِمامِ باعزت رہے۔ اَور حضرتِ اعلےٰ رحمتہ اللہ علیہ کے بعد میرے والدِ قبلہ وکعبہ رحمتہ اللہ علیہ کے اَیسے خدمت گزار ثابت ہوئے۔ جَیسے حضرتؒ کے تھے۔ بلکہ اس وقت سے بڑھ کر۔ کیونکہ اَب رُشد آگیا تھا اور رجُوع اِلی اللہ پیدا بھی ہو گیا۔ سفر میں اکثر ساتھ ہوتے تھے۔ اور تمام قلم دانِ وزارت ان کے پاس ہوتا تھا۔ جو چاہتے کرتے اور کراتے۔

آپ کے وصال کے بعد میرے ساتھ بھی ویسے گزار گئے۔ جیسے ایک خدمت گزار حقیقی یا ایک مخلصِ جانباز گزارتا ہے۔ سفر و حضر میں یہ ساتھی رہے۔ اور ہر کام اور شغل میں میرے ممد رہے۔ حضرت میاں صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے غلامی کے وقت بھی میرے ہمراہ سرہند شریف آ رہے تھے۔ اور دوسرے دن میری خبر لینے کے لئے شرقپور پہنچ کر شرفِ زیارت سے مشرف ہوئے۔ آپ نے بہت مہربانی فرمائی۔ ایسے ہی شاہ ابو الخیر دہلوی رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ تو آپ نے بھی ان پر بہت شفقت فرمائی۔ غرض جس ولیُ اللہ اور عارف باللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرتِ اعلیٰ کی خدمت گزاری کی وجہ سے یا ذاتی صلاحیت کی وجہ اکثر بزرگوں کی نوازش سے سرفراز ہوئے۔

لیکن عجب معاملہ ہے۔ تسکین و طمانیت کامل نہیں۔ رونے دھونے میں اور خوفِ الٰہی میں اُن کا دوسرا کوئی نہیں۔ محبتِ پیر خانہ میں یگانے ہیں۔ میرے بچوں اور بچوں کے بچوں سے بھی وہی محبت و اخلاص ہے۔ جو اپنے مرشدِ کامل کے ساتھ۔ اب سات پشتی خادم ہے۔ اور ہر ایک سے اخلاص۔ چھوٹے بچے عمر مرتضٰی، برخوردار سعید احمد کے ساتھ بھی خاص اُنس ہے۔ اور تمام خانوادے کے دعا گو۔

یک طرفہ استعداد ہے۔ استعداد کُلی نہیں۔ ورنہ ان کی خدمت کے مقابلہ یہ ادج ملکِ طریقت پر ہوتے۔

اکثر اُلجھ جاتے ہیں کہ اس خدمت گار بوڑھے کو کچھ نہیں ملا۔ دوسرے جیت گئے لیکن یہ نہیں جانتے۔ یہ دولت کسبی صرف نہیں۔ موہبتِ عظمٰی کو اس میں بڑا دخل ہے۔ قرآنِ حکیم کا فیصلہ خود ہے: وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ۔ اب وہ بوڑھے ہو چکے ہیں۔ اسّی نوّے سے زیادہ عمر ہو چکی ہے۔ اور میرے کہنے پر وہ اپنے گاؤں پنڈی لالہ ضلع گجرات میں بوریا بچھا کر بیٹھ گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمتِ خاصہ سے انہیں سرفراز فرما دے اور استقامت بخشے۔[1]

---

[1] میاں کرم دین صاحب آخری عمر میں حضرت قبلہ عالم رحمتہ اللہ علیہ (مؤلف حالات) کے پاس خانقاہ معلّٰی بیربل شریف آگئے تھے۔ اور اکثر بیمار رہنے لگے تھے۔ حضرت قبلہ عالمؒ ان کا خاص خیال فرماتے۔ اور اکثر خادموں کو ان کی دیکھ بھال کرنے پر معمور کر رکھا تھا۔ ان کی مرض الموت میں راقم کو بھی ان کی خدمت کا موقع ملا۔ غالباً سنہ ۱۹۶۶ء میں حضرت کی زندگی میں وفات پائی۔ اور بیربل شریف میں حضرتِ اعلیٰ کے روضہ کے شمال مشرق میں دفن ہوئے۔ مرتب۔

اصل میں اللہ تعالےٰ کی رحمت واسع تو ان پر اتنی ہے، جتنی ہمارے دوستوں میں سے کسی پر نہیں۔ لیکن وہ رحمت، دولت وفضل کو خیال کرتے ہیں۔ مسند دولت کے ڈھیروں سے بھری ہو۔ اور اَلْفَقْرُ فَخْرِیْ کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ جو خَاتَمُ النَّبِیِّیْن رَحْمَۃٌ لِّلْعٰلَمِیْن صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے طلب فرمائی۔ اور جس پر آپؐ نے زندگی بسر فرمائی۔

توجّہ: اور حضرتِ اعلےٰؒ کی اِس طرف توجہ نہ تھی۔ کہ کچھ طلب نہ تھی۔ اگر تھی تو صرف رضائے مولےٰ اور بس۔ میں نے بہت کم بزرگ اس رضا وتسلیم کے دیکھے۔ اللہ تعالیٰ کی لاکھ لاکھ ان پر رحمتیں ہوں۔ وہ اپنے نمونے کے آپ نمونہ تھے۔ نَوَّرَ اللّٰہُ مَرْقَدَہٗ۔

۸۴-۸۵ کا سِن ہو چکا، لیکن ابھی وُہ محبّت کا اوّل دِن ہے کہ ع

فدا لپیٹ کے رد لوں تیرے سنگِ آستاں سے

آتے تو آنسوؤں کی بارش ہو رہی ہوتی ہے۔ جاتے ہیں تو آنسو گر رہے ہوتے۔ سچ تو یہ ہے کہ کامل فقر کا ڈسا ایسے اثر کبھی نہیں ہوتا۔ عمر بھر زہر چڑھی رہتی ہے، جسے مارِ محبّت نے ڈسا ہو۔

ایک واقعہ: سِندھ کے ایک بزرگ کا ایک جوان، مرید ہوا۔ آپ نے تلقین فرمائی جوان تھا بھول گیا۔ اور آوارہ ہو گیا۔ کسی نے اس کی حضرت صاحب سے شکایت کی۔ ایک دِن وہ حاضر ہوا تو آپ نے دریافت کیا۔ کچھ اثر بھی بیعت کے بعد ہوا۔ کہا کچھ نہیں۔ صرف ایک دو بار آپ خواب میں آئے۔ فرمایا۔ سانپ کے ڈسے کو ایک دن زہر چڑھ جائے گا۔

پیر صاحب تو وفات پا گئے۔ لیکن کچھ سالوں کے بعد اُس کا حال بدل گیا۔ آخر یادِ الٰہی میں ایسے مصروف ہوئے کہ آخر ایک دُنیا کے مقتدیٰ ہو گئے۔ اور پیر صاحب کا فرمُودہ صحیح ثابت ہوا۔ اور وُہ اُن کے سجادہ پر بیٹھے۔

ہمارے حضرتؒ کی نظر بھی پُر تاثیر تھی۔ جس پر پڑی، آپؒ کے فقر کے سامنے سر خم ہمیشہ رکھا۔ اُسے فائدہ یا فیض پہنچا ہو یا نہ۔ لیکن آپ کے فقر کا کوئی بھی منکر نہیں ہوا۔ اور نظر کبھی خطا نہ گئی ؎

نہیں فقر و سلطنت میں کوئی امتیاز ایسا
یہ سپاہ کی تیغ بازی، وہ نگاہ کی تیغ بازی

Marfat.com

فقر اتنا بلند ہوتا ہے جتنا انسان خود بلند ہوتا ہے۔ سفلہ جذبات جتنے کم ہونگے اتنی ترقی علوی جذبات میں ہوگی۔ اور ملأ اعلےٰ کے ساتھ مناسبت پیدا ہوگی۔ محبت سفلی کم ہوگی تو محبتِ علوی بڑھے گی۔ مناسبتِ تمام اور استعداد کامل یہی ہوتی ہے۔ کہ جذبات عالیہ مکمّل ہوں۔ اور جذباتِ سفلی یا تو ہوں ہی نہیں یا دب کر بے جان ہو جاویں۔

میاں چراغ دین صاحب: میاں چراغ دین موچی سکنہ کوٹ مغرب نہایت صالح جوان تھے۔ جوانی کے ایام میں حضرتؒ سے تعلق ہوگیا۔ تقریباً تیس بتیس سال متواتر اندھیری راتوں میں بھی اور بارش بھری سیاہی میں بھی وہ برابر رات کو شام کا کھانا کھا کر عشاء سے پہلے جب حضورؒ کھانا کھا رہے ہوتے تھے تو آجاتے تھے۔ اور صبح کی آذان پر گھر چلے جاتے تھے اور صبح کی نماز اپنے گاؤں میں باجماعت ادا کرتے تھے۔ رات بھر کی خدمت، مثلاً عشاء کا وضو بستر، چاپی، اور پلیاں ملنا ایک معمول ہوگیا تھا۔ ایسے ہی سحری کے وقت گرم و سرد پانی مہیا کرنا، وضو کرانا ان کی خدمت میں تھا۔ ان کے ساتھ روشن کمہار بھی اکثر آیا کرتا تھا۔ یہ خدمت انہوں نے ایسی نبھائی، کہ کبھی خلل نہ آیا۔ حضرتؒ کی وفات کے بعد وفات پائی۔ کوئی اولاد نہ تھی۔ اللہ تعالےٰ ان پر رحمت برسائے۔ خاموش اور خدمت گزار خادم تھے۔

میاں جیون: ایک دوسرے موچی میاں جیون کدلٹھی کے رہنے والے بڑے جوان تھے اور قد اور جسم بھی اچھا خاصہ تھا۔ آپ کے مخلصین میں تھے۔ جمعہ کو آیا کرتے تھے۔

حاجی فتح خان صاحب: سردار شیر خان رحمتہ اللہ علیہ کے بھتیجے، حاجی فتح خان صاحب جوانی کے عالم حضرتؒ کے بیعت ہوئے۔ لیکن یہ ایسے مرید ہوئے کہ صورت و سیرت کا نقشہ حضرت قبلہؒ جیسا ہوگیا۔ دور سے دیکھنے والا ہمیشہ یہ سمجھتا تھا کہ حضرت اقدسؒ آرہے ہیں۔ فنا فی الشیخ کے نمونہ تھے۔ گورئیس تھے۔ ذکر و فکر اور عبادت و طہارت، چال ڈھال میں غرض نقش میں حضرتؒ کا نقشِ ثانی تھے۔ جمعہ کے روز آیا کرتے تھے۔ اس زمانے گھوڑے گھوڑیاں بہت عمدہ، رئیس رکھا کرتے تھے۔ ہمیشہ راستے سے گھوڑی واپس کردی جاتی تھی۔ اور ہر جمعہ بیربل شریف حضرت کی اقتداء میں ادا کرتے تھے۔ اور عصر کی نماز سے فارغ ہو کر خانقاہِ معلّٰی سے پا پیادہ چل دیتے تھے۔ اور خادم پھر راستہ میں گھوڑی لے کر پہنچتا۔ حاجی

صاحب نے کئی بار حج بیت اللہ کے مصارف کی پیشکش حضرتؒ کو کی۔ اور حضرت اعلیٰ الٰہیؒ پیر و مرشد کی خدمت میں حاضری کی اجازت چاہی۔ تو آپ نے فرمایا۔ طلباء کہاں جائیں گے اور یہ خدمت کیا حج سے کم ہے۔ اور آپ کا یہ ہی حج ہے۔

اصل تو یہ ہے کہ آپ پر حج کبھی بھی فرض نہیں ہوا۔ جو آتا تھا، لنگر میں صرف ہو جاتا تھا۔ کچھ بچتا تھا تو کتب خرید کر لی جاتی تھیں۔ رہا سہا عمارتِ مساجد پر خرچ ہو جاتا تھا۔ حضرت اعلےٰ نورُ اللہ مرقدہٗ کا یہی خیال ہو گا۔ جب فرض نہیں تو پھر یہ تمام رونقِ دینی کیوں ختم کر دی جائیں

حاجی صاحب کے دو بھائی اور بھی تھے۔ ایک کا نام شیر محمدؐ، دوسرے کا نام گل محمدؐ تھا۔ دونوں صوم و صلوٰۃ کے پابند اور پورے دیندار تھے اور دنیاوی امور وہی سرانجام دیتے تھے حاجی صاحب کے ذمے گھریلو انتظام تھا۔ اور کرتے دھرتے حاجی صاحب ہی تھے۔

سردار گل محمدؐ خان: اللہ اکبر حضرت کا کیا تصرف تھا۔ ہر مرید خواہ کیسی زندگی گزارتا رہا ہو لیکن آخر وقت کچھ ایسے وسائل پیدا ہو جاتے تھے، کہ اس مرید کی زندگی کا رخ بدل جاتا تھا ایک نہیں، سینکڑوں میں نے دیکھے۔ سردار گل محمد خان بھی ان میں ایک نمونہ یادگار ہیں۔

حضرت اعلیٰؒ کو وفات پائے کئی سال گزر گئے۔ اور دونوں بھائی بھی گزر گئے سردار گل محمد خان اپنے گرد و قریب اپنے مقام پر پہنچ چکے تھے۔ کہ اچانک دربارِ رسالت میں حاضری کا شوق غالب ہو گیا۔ انگریز کا زمانہ، پیسہ ٹکالے جانے کی کوئی پابندی نہ تھی، پیسہ روپیہ کی بڑی قیمت تھی۔ سنا ہے دس روپیہ لے کر سردار صاحب نے چلنے کا ارادہ کیا۔ اور روانگی سے پہلے وہ حضرتِ اقدسؒ کے روضۂ پاک پر حاضر ہوئے۔ خاندان کے سربراہوں کو بھی روضۂ اطہر پر لائے۔ ان کا بڑا بیٹا فیض محمد بھی ہمراہ تھا۔ یہ بندہ بھی اپنے والدِ مرحوم کے قائم مقام موجود تھا۔ دعا کرائی۔ اور ہماری موجودگی میں بیٹے کو کہا کہ میں نے حضرتؒ کی بیعت دیکھا دیکھی نہیں کی۔ بلکہ بہت کچھ دیکھ کر کی۔ یہ میرے پیر تھے، اور یہ ان کے صاحبزادے ہیں ہمیشہ ایک پلہ بھوسہ لنگر کو دیا کرتا ہوں۔ زیادہ نہ ہو تو یہ خدمت کرتے رہنا۔ پھر فرمایا کہ آخری نمازِ جنازہ حضرتؒ میں بھی ہم آپ کی کرامت سے شامل ہوئے۔ سردار صاحب اپنے برادری سردار کے قتل میں ملزم ہو کر حوالات تھے۔ حضرت کو رات کو خواب میں دیکھا اور صبح شیشن نے ان کو بری

کر دیا۔ اور رہائی کے بعد سید سے بریل پہنچے۔ جبکہ آپ کے جنازہ کے صفوف قائم ہوچکے تھے۔ تو ان سواروں کو گھوڑے دوڑاتے دیکھا۔ اور چند منٹ کے لیئے جنازہ کی نماز روک دی گئی۔ آخر وہ آئے۔ نمازِ جنازہ میں شریک ہوئے۔

خود سوچئے۔ جن لوگوں نے اپنے مشاہدہ میں وہ کچھ دیکھا ہو، جو عقل سے بلند ہے اور جس میں قدرتِ الٰہیہ کے ظہور کے سوا کوئی دوسرا ذریعہ خیال نہ کیا جا سکے۔ تو ان کے عقائد اور ان کے خیال کو کوئی دوسری طرف کیسے پلٹ سکتا ہے۔

جو لوگ طریقت کے قائل نہیں اور بیعت کو ایک فضول غیر دینی رسم خیال کرتے ہیں۔ وہ یہ نہیں دیکھ سکتے کہ اصل دین کی بنیاد تو بیعتِ رسالت پر تھی جب رسولؐ جانتے تو رحمت کے دروازے کھلتے۔ کفار پہ کیوں نہ کھلتے۔ وہ رسالت کے تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہاں بیعت کا اختیار کرنا رسالت اور نائبِ رسالت کے سامنے جھکنا، یہ بھی تو فضل اللہ سے ہوتا ہے۔

حاجی صاحب فتح خاں کی لڑکی: حاجی گل محمد خان کے ہمراہ حاجی سردار فتح خاں کی لڑکی بھی حج پر گئیں۔ وہ ایک مدت سے بیوہ تھیں۔ اپنے خاندان میں شادی ہوئی تھی جوانی کے عالم میں ہی بیوہ ہوگئیں۔ قدرتِ خدا جب واپسی پر جدّہ پہنچیں تو بیمار تھیں۔ روزانہ دعا کیا کرتی تھیں کہ اللہ تعالیٰ مجھے اس سرزمین میں دفن کرائے۔ آخر روانگی سے پہلے ان کی وفات ہوگئی۔ اور جدّہ شریف میں دفن ہونا نصیب ہوا۔

انجام سردار گل محمّد خان: اِدھر سردار صاحب جب حج سے واپس ہوئے تو رستے ہی میں بیمار ہوئے۔ اور گھر بیماری کی حالت میں پہنچے۔ اور تقریباً چھ سات سال بیمار رہنے کے بعد ایک خالص بندۂ اللہ تعالیٰ ہو کر دربارِ خداوندی جانا نصیب ہوا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

صحبت کا اثر: ؎ صحبتِ صالح ترا صالح کُند
صحبتِ طالع ترا طالع کُند

سردار صاحب کی زندگی میں ان کے بڑے صاحبزادے کو صحبتِ اہلِ تشیع ہو گئی اور وہ شیعہ ہو گئے اور اس کے زیرِ اثر باقی بھائی بھی تمام شیعہ مذہب میں داخل ہو

گئے۔ جب جنازہ سردار صاحب پر گئے، تو عجب مخمصہ تھا۔ ان کے بڑے تعلق تھے اور وُہ اکیلے سُنّی تھے۔ لیکن کوٹ پر شیعہ اثر غالب ہو چکا تھا۔ ایسے حال میں ہمارے جیسے علماء کا وہاں جانا بڑا مشکل تھا۔

لیکن میرے چچا صاحب اور دیگر گئے۔ اور جنازہ کے بعد قُل کی رسم پڑھی گئے۔ مجھے بھی کہا گیا میں نے کہا۔ اب ہماری وہاں قیمت نہیں۔ بلکہ وُہ ہمیں اپنی رسوائی خیال میں گے۔ چنانچہ بات وہی ہوئی۔ کسی نے ہمارے بزرگوں کی طرف کوئی توجّہ خاص نہ کی۔

ایک مدّت کے بعد پھر اب خدا کا فضل ہے کہ وہ لوگ اگرچہ بعض دُوسرے مذاہب میں داخل ہیں۔ لیکن ہمارے خاندان کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اور جانتے ہیں کہ ان کا گھر ایک دینی مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔

آفتابِ ولایت: جب آفتابِ ولایت نصفُ النّہار پر ہوتا ہے، تو اس کی روشنی اندھیری کوٹھڑیوں میں بھی چلی جاتی ہے۔ کوئی جگہ اس کی روشنی سے خالی نہیں رہتی یہی حال ہمارے حضرت اقدس کے عروجِ ولایت کا تھا۔ علاقہ تمام آپ کے زیرِ نگیں تھا۔ ایک طرف سے لوگ آتے تھے، دوسری طرف سے جھولیاں بھر بھر کر نکلتے۔

اسی کوٹ بھائیخان کے خاندانِ ریاست کا یہ حال تھا۔ بچے، جوان بوڑھے سب کے سب کا تانا بیربل کے راستہ لگا رہتا تھا یَأْتُوكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّأْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ۔ اس کے گرداگرد رستوں میں گڑھے پڑ گئے تھے۔ یعنی گزرگاہ گزر کی وجہ سے پست ہو گئے تھے۔

طریقت کا پرتو: پھر طریقت کا پرتو بھی عجیب ہے۔ جب یہ اوج پر ہوتا ہے اور تمام پر یکساں روشنی پڑتی ہے تو شاہ و گدا کی تمیز اٹھ جاتی ہے۔ نہ خود سرکار کے کوئی مخصوص انداز رہ جاتے ہیں، نہ ناظرین کو اپنے حقوق میں کچھ تفاوت نظر آتا ہے۔ یکسانیت اور موزونیت نظر آتی ہے۔

تواضع کا نمونہ: حاجی سردار فتح خان صاحب کا ذکر گزر چکا ہے کہ وُہ جمعہ ادا بیربل شریف کیا کرتے تھے۔ اور گاہ گاہ سواری کے بغیر تعظیماً چلے آتے تھے۔ ایک بوڑھا کمہار

نذر نامی بھی وہاں سے آیا کرتے تھے۔ اور دنیا دیکھتی تھی کہ سردار صاحب اس کی لاٹھی پکڑے ہوئے چل رہے ہوتے تھے۔ نوکر ساتھ ہوتا بھی تو یہ خدمتِ الٰہیہ خود سرانجام دیتے تھے

تواضع زِ گردن بلنداں نکوست
گدا اگر تواضع کند خوئے اوست

مولوی غلام محمدؒ صاحب: مولوی غلام محمد صاحب نے بیربل ہی پڑھا لکھا۔ لیکن خط نہائت عربی، فارسی کا اچھا تھا۔ حضرتؒ کے تحریراتِ مسودہ جات اور فتویٰ جات کو اکثر وہی نقل کرتے تھے۔ خط واضح موتیوں کی طرح تھا۔ اب بھی میرے والد علیہ الرحمۃ کے اکثر بیاض پر ان کے نقول ملتے ہیں۔ خود خوش شکل تھے۔ اشعار کہتے تھے۔ شاہ پور بھیرہ سڑک پر عمر بھر ریل کی تمنا اور انتظار رہی۔ اکثر شوق میں آکر ریل کے لئے بھی اشعار لکھ دیتے تھے۔ اور کئی نظمیں بھی مسائلِ دین پر لکھی تھیں۔ دوسرے تیسرے دن ضرور آیا کرتے تھے۔ اور اپنی خدمت اور فریضہ ادا کر کے حضرتؒ کی خوشنودی حاصل کرتے۔ میرے والد علیہ الرحمۃ کے ساتھ اُنس و محبت تھی۔ اکثر بوجہ اُستادی شاگردی تعلق ان کے زیرِ دامن بیٹھے رہا کرتے تھے

مولوی قمر الدینؒ صاحب: مولوی قمر الدین صاحب والدِ بزرگوار مولوی عبدالرسول صاحب مصنف انوارِ مرتضویہ، اچھے خاصے مولوی تھے۔ صدر شاہپور المعروف چھاؤنی میں نقول ایجنٹ تھے۔ کیونکہ یہ اُس وقت صدرِ ضلع تھی۔ بھیرہ شہر کی آبادی بڑے زمینداروں سے پُر ہے۔ اور زمانے کے مطابق وہاں شادیوں پر رنڈیاں (رقاصہ) لانا ایک عادت ہو گئی تھی۔ مولانا کی تمام عمر اسی جہاد میں گزر گئی۔ اور بڑے بڑے زمینداروں کے مقابل ہو جاتے تھے۔ اور وہ کچھ کہتے جو وہ سُننا پسند نہ کرتے تھے۔

ہمیشہ حضرتِ اقدس رحمۃ اللہ علیہ کو ایامِ تعطیلاتِ سرما کرسمس ڈے اچھے دنوں میں اپنے گھر لے جاتے تھے۔ چونکہ اکثر مولوی صاحب کی برادری بھی خادم سرکار تھی۔ اس لئے کئی دن نہائت مکلف دعوتوں اور شان و شوکت سے دین اور طریقت کی خدمت سرانجام دیتے تھے۔ اور زری دار جوتے مبارک پیش کرتے تھے۔ آپ کا سبز پاپوش خاص طور پر ایک خاص موچی سے زری دار بنا کر لایا کرتے تھے۔ حضرتِ اقدسؒ اپنے مربّی

اُور اُستاد حضرت الٰہیؒ کی سنّت کے مطابق سبز زری دار جوڑا پہنا کرتے تھے۔ غرض حضرتؒ کے صاحبزادوں تک کپڑے اُور خلعتیں پیش ہوتی تھیں۔ اُور یہ ایّام بکثر موضع کے لئے بہار کے ایّام گنے جاتے تھے۔ مولانا کے تمام رشتہ دار رخصتوں میں بکثر آجاتے تھے۔ اور بڑے تزک واحتشام سے یہ دِن اپنے پیر کی خدمت میں گزارتے تھے۔

مُستقل خِدمَت: حضرتؒ کی محبّت کا یہ حال تھا کہ ہر آن اور ہر گھڑی حضرتِ اقدسؒ کی محبّت اُن کے الفاظ، ان کے حرکات سے ٹپکتی۔ گِن کر ایّام گزارتے تھے۔ اور جب اتوار آتا، تو آپ ایک ڈبہ (نقل حضرت اقدسؒ) ہاتھ لئے ہوئے چہارم دِن چڑھے پہنچ جاتے تھے۔ حضرتِ اقدسؒ بھی ضحےٰ پڑھ کر فارغ ہوتے۔ یہ جاتے ہدیہ پیش کر دیتے۔ اُور حسبِ محبّت عرض معروض شروع کر دیتے تھے۔ اور تقریباً ۳ بجے شام اجازت لے کر گھر آجاتے یہ معمول اِتنا پختہ تھا کہ بہت کم قضا ہوا ہوگا۔ اور عمر بھر گزار گئے

نقل: یہ ڈبہ چائے کیلئے لایا کرتے تھے۔ حسبِ پسند حضرتؒ گاہ بالوشاہی اور گاہے گلاب جامن، غرض موسم کے مطابق شیرینی اِس میں ہوتی۔ آپؒ چائے سادہ بِلا دُودھ اِستعمال کرتے۔ اُور خادم باہر ہی حجرے کے سامنے پکاتا۔

ایک کرامت: ایک بہت بڑے بزرگ اِس علاقہ میں سالانہ آیا کرتے تھے۔ اور علاقہ بھر میں دعوتیں بہت بڑی ہوتی تھیں۔ اُور بہت خلقت کا انبوہ ان کے ساتھ ہوتا۔ عروجِ کامل تھا اطراف سے بھی عوام وخواص زیارت کے لئے حاضر ہوتے۔ ایک بار ان کی دعوت ایک بڑے زمیندار نے بھی کی۔ اور بہت بڑی دعوت کی۔ حضرت مولوی صاحب میں حسد کا مادہ بہت زیادہ تھا۔ اُور اپنے پیر کے سِوا کسی کو دیکھنا تو کُجا۔ دوسرے کے دیکھنے پر بھی حسد ہوتا تھا۔

حاضر ہوئے تو پہلے یہی شکایت کی کہ فلاں آئے تھے، اور اشو، لشو نے دعوت کی تھی۔ اشو' اللہ بخش اور لشو' خدابخش کا حقارتاً مخفف تھا۔ اور کہا۔ دُنیا اُلٹ گئی۔ معلوم نہیں کیا ان کو مِلتا ہے۔ حضرتؒ نے فرمایا۔ بہت خلقت تھی۔ کہاں تھی بہت۔ مولوی صاحب کی پریشانی دیکھ کر فرمایا: "اَب وہ نہیں آئیں گے"۔

یہی حال: قاضی تلّی والے یہاں بیان کرتے ہیں، کہ جب تلّی میں پیر صاحب تشریف لائے

اَور مَیں (حضرتؒ کی خدمت میں) حاضر ہوا۔ تو آپ نے دریافت کیا کہ تم بھی حاضر ہوئے۔ عرض کیا۔ حضرتؒ، میں تو نہیں گیا۔ حضرتؒ خوش ہو گئے۔ فرمایا: شاباش! شاباش!! اب پھر نہیں آئیں گے۔ چنانچہ ایسے ہی ہوا۔ تمام علاقہ میں ان کی تشریف ساوں ہوتی رہی۔ لیکن نلی کے کسی آدمی نے اُن کو دعوت نہ دی۔ یہ کیا تھا۔ وہی نسبتِ اویسی۔ ورنہ درویش کو کسی سے کیا تعلق۔ وُہ تو سراسر محبّت ہوتے ہیں۔ خصوصاً اپنی برادری سے۔ لیکن یہ نسبت محبت کو نہیں دیکھتی۔ یہ اپنی خودی میں سرمَست ہوتی ہے۔ اَور قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ، اَللّٰهُ الصَّمَد، بول رہی ہوتی ہے۔

آپ کے وصال کے وقت جب آپ کو بخار تیز ہو گیا تو مولوی صاحب کو خیال آیا کہ آپ کسی کو مجاز نہیں فرما گئے اور یہ کمی واقع ہو رہی ہے۔ آپ بُخار کی وجہ سے بیہوش تھے مولانا نے بعض اصحاب کے مشورہ سے حضرتؒ سے دریافت کرنا چاہا کہ فلاں کو اجازت، آپ نہ معلوم بیماری کی وجہ سے یا حقیقتاً اجازت کے معنوں میں "ہوں" کے الفاظ سنائی دیتے تھے۔ غرض ایک گھڑی میں دس بارہ آدمی سے زیادہ مجاز گردان دیئے، جس میں خود بھی شامل تھے۔ اَور ہر سہ ۳ صاحبزادگان۔

ظاہراً تو یہ بات بڑی بھلی معلوم ہوتی تھی۔ لیکن نتیجۃً وُہ بہت بڑی خرابی کا باعث ہوئی۔ اور مرکزِ خلافت ٹکرے ٹکڑے ہو گیا۔ کوئی امتیاز حضرتؒ کے سجادہ کا نہ رہا۔ میرے والد علیہ الرحمۃ ان پاک ہستیوں سے تھے۔ جن کو کوئی خاص تعلق دنیا سے نہیں ہوتا۔ اور کوئی خاص مقصد لے کر زندگی بسر نہیں کرتے۔ اور حکم کے تابع ہوتے ہیں۔ حضرت قبلہ والد صاحبؒ حضرتؒ کے فرمان پر ہمیشہ تعلیم میں سرگرم رہے۔ اور حضرتؒ کے بعد تمام خدمتِ علم آپ کے سپرد تھی۔ وہ رات دن اسی شغل میں رہا کرتے تھے۔ قوتِ لایموت کی طرح گزران تھی۔ کیونکہ زمین بہت تھوڑی لنگر کی تھی۔ جس میں سے پیداوار کا نصف تو لنگر کا شمار ہوتا تھا۔ بقیہ نصف حصہ کے چہار حصے کئے جاتے تھے۔ ہر سہ ۳ صاحبزادگان کے تین حصے اور خود حضور قبلہؒ کا ایک حصہ۔

تعویذ گنڈا بھی دُوسرے بھائی کرتے تھے۔ کوئی خاص آدمی آجاتا تھا تو دِلا یا کرتے

تھے۔ یہ خدمت ان کے چھوٹے بھائی صاحب نے سنبھالی تھی۔ اور اس قدر انہوں نے ترقی دی۔ دنیا اتوار کو ان کو گھیرے ہوتی تھی۔ لیکن اس کا انجام یہ ہوا کہ مرکز ختم ہوگیا اور کسی کو مرکز کے ساتھ محبت نہ رہی۔ اس کے علاوہ کامل بزرگ خود بھی سب کچھ ہوتا ہے۔ وہ کسی دوسرے کے لیئے کچھ نہیں جوڑتا۔ تمام عقیدت تمام مخلصین میں صرف حضرتؒ کی ذات کے ساتھ تھی۔ اولاد کے ساتھ کسی کو کوئی عقیدت نہ تھی۔ جو تھی وہ بھی امتیاز اٹھانے نہیں جاتی رہی۔ لیکن انجام کار خود مولوی صاحب بھی مایوسانہ حالت میں حضرت سراج الدین صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنی تشنہ لبی کا ذکر کیا کہ سلوک طے نہیں ہوا۔ جیسے پہلے لکھا گیا۔ حضرتِ اعلیٰ نور اللہ مرقدہٗ کو نسبتِ تکوینی کی وجہ سے طریقت پر کوئی خاص توجہ نہ تھی وہ توجہ ڈالنے کو ایک عبث خیال کرتے تھے۔ اور ایک کھیل۔

حضرت قبلہ سراج الدین صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے مولانا کو تلقین فرمائی اور ذکر و فکر بتلایا۔ لیکن چند دن ہی گزرے تھے۔ کہ سینہ سے خون آنا شروع ہوگیا۔ اس کے بعد سخت بخار ہوگیا۔ اور حکم دیا کہ ان کو اپنے پیر بھائی قاضی صاحب نلّی والے کے پاس پہنچا دیا جائے۔ آپ ڈیپ شریف متصل کُفری بایام موسم گرما مقام فرمائے ہوئے تھے چنانچہ وہاں پہنچے۔ قاضی صاحب نے وہاں سے بکھر پہنچا دیا۔

غرض وہ درد اپنے ساتھ لے گئے۔ وجہ یہی تھی کہ حضرتؒ کی غیرت غالب تھی۔ جب کبھی کسی نے دوسری طرف توجہ کی تو بخار یا کسی دوسری صورت میں وہ نمودار ہوگئی چنانچہ یہی واقعہ قاضی صاحب کے ساتھ ہوا۔ جس کی تفصیل دی جائے گی۔

میاں عبدالرزّاق: میاں عبدالرزاق مرحوم بھی حضرتؒ کے خاص خادموں سے تھے اور بہت عقیدت مند تھے۔ جلپانہ متصل چھاؤنی شاہپور میں امامت کراتے تھے۔ تین ۳ لڑکے تھے بھوکے تھے اور عمر بھر اسی خیال میں رہے۔ اور کیمیا کے خیال نے انہیں کسی طرف کا نہ چھوڑا۔ ہم بچپنے میں تھے گاہ گاہ ان سے سونے کا پوچھتے تھے۔ کہتے کہ سونا تو بن جاتا۔ صرف ساون میں رنگ بگڑ جاتا ہے۔ میں نے کہا کہ ہمیں ایسے ہی سونا دے دیا جائے۔ بن بنالیں گے اور ساون کے مہینے میں ہوا نہ لگوائیں گے۔

بعض وقت ان سے حضرتِ اقدس رح خوشی بھی کر لیتے ۔ ایک بار کسی نے میاں صاحب سے کہا کہ اگر فلاں رشتہ مِل جائے تو بیس گھوڑی دوں گا ۔ میاں صاحب نے جوش میں یہ عرض گزار دیا ۔ آپ رح خاموش رہے ۔ پھر کسی دِن آپ خوش بیٹھے تو اچانک آپ نے میاں عبدالرزاق سے کہا کہ وُہ گھوڑی والا کہاں گیا ۔ عرض کی ، موجود ہے ۔ چنانچہ میاں صاحب نے اس کو اطلاع دی ۔ وُہ آیا ۔ حضرت رح نے تعویذ دے دیا ۔

قدرتِ خُدا چند ایّام کے بعد اس لڑکی کی منگنی ہو گئی ۔ وُہ حاضر ہوا ۔ عرض گزاری آپ خاموش رہے ۔ پھر اس کی شادی کی تاریخ مقرر ہو گئی ۔ پھر عرض گزار ہوا ۔ خاموش رہے پھر بھی اس دن حاضر ہوا ، جب شادی کے لئے برات آئی ہوئی تھی ۔ اور عرض کیا ۔ آپ رح نے جواباً فرمایا ۔ وہ لڑکی تیری عورت ہے ، جا ۔

چنانچہ رات کو برات آئی ۔ کھانا کھایا گیا ۔ کھانے کے بعد کچھ آپس میں باتیں ہوئیں تو فریقین میں اختلاف ہو گیا ۔ اور اس اختلاف پر لڑکی کا والد اُٹھا ۔ اور اس نے اس آدمی کو بلا کر لڑکی کا نکاح کر دیا ۔ اور اسی وقت اس نے رُخصت کر دیا ۔ برات جب صُبح اٹھی ، تو کاروان اُلٹ چکا تھا ۔ پھر کیا تھا ۔ خالی واپس گئی اور وہ میاں بیوی آباد ہوئے اور بچے پیدا ہوئے

میاں عبد الرّزاق کے تین لڑکے تھے ۔ اور تینوں بیربل شریف کے درس میں پڑھتے تھے ۔ اور کوئی بھی ان سے اچھا خاصہ مولوی نہ بن سکا ۔ ان کا ایک لڑکا غلام رسول نامی تھا ۔ جیسے جوانوں کا کام ہوتا ہے ۔ کسی زمیندار لڑکی کا اِغوا کر کے لے گیا اور ملتان چلا گیا ۔ جلیانہ واحد ملکیت پٹھانوں کا تھا ۔ میاں عبدالرزاق آئے اور ماجرا سُنایا ۔ اِلتجا کی ، سردار بڑا زبردست ہے ۔ پھر زمیندار قوم ہے ۔ وہاں رہنا محال ہے ۔ دُعا فرما دیں کہ غلام رسول باز و واپس کر دے آپ جوش میں آ گئے ۔ اَب پُولی نہیں بنتا (بافندہ نہیں کہلانا) ۔ یعنی باز و منت واپس کرنا ۔

حضرت رح کا کہنا کیا تھا ۔ خود بخود آتشِ غضب ٹھنڈی ہو گئی ۔ اور بے منّت غلام رسول زوجہ کو لے کر اپنے گھر آ گیا ۔ اور کسی نے تعرّض نہ کیا ۔

غرض بے شمار واقعات ایسے ہیں ، کہ جہاں عقل دَنگ رہ جاتی ہے ۔ اور قدرتِ خُدا کے سِوا کوئی چیز نظر نہیں آتی ۔

Marfat.com

باب ہفتم

خلفائے مجاز

اَب میں ان مخلصین حضرات کا ذکر کرتا ہوں، جن کو مجاز خیال کیا جاتا ہے اَور جن پر عوام کو اعتمادِ بزرگی تھا۔

قاضی غلام محمدؒ صاحب شاہپوری

قاضی غلام محمدؐ ساکن شاہپور شہر، آپ کے ان مخلصین سے ہیں، جن کو عوام و خواص حضرتؒ کے خاص الخاص خادم خیال کرتے تھے۔ آپ کچھ لکھے پڑھے نہ تھے۔ البتہ آپ کی ذاتِ بابرکات کے ساتھ بڑی عقیدت تھی۔ اگرچہ بلند اقوام سے نہ تھے۔ لیکن عوام و خواص کے مرکز تھے۔

شاہ پوری سید صالح بھی تھے۔ اور وَیسے دُنیادار بھی تھے۔ اَور کئی خاندانوں میں تقسیم تھے۔ بعض شیعہ بھی تھے۔ ان کے علاوہ دُوسری اقوام بھی مالک تھے مثلاً جھمٹ، لیکن قاضی صاحب کو تمام اچھے جانتے۔ تکلیف کے وقت ان کے پاس جاتے۔ شہر کے ہندوؤں میں بھی اعتبار اور اعتماد تھا۔ صاحبِ کشف بھی تھے۔ بعض وقت خصوصًا بارشوں کی بابت پہلے علم ہوجاتا تھا۔ اَور جمعہ کے روز اکثر حاضرِ خدمت ہوجاتے تھے۔

ایک جمعہ کو ضحیٰ کے بعد کئی بار فرمایا۔ کہ قاضی غلام محمدؐ نہیں آئے۔ عرض کیا گیا کہ ابھی تک نہیں آئے۔ گرمی کا موسم تھا۔ دوپہر کی کڑاکے کی دھوپ میں بھی اذانِ جمعہ سے پہلے حاضر ہوگئے۔ جب پیشِ خدمت ہوئے تو حضرتؒ نے زیرِلب تبسم سے فرمایا۔ خبر ہوگئی تھی۔ عرض کیا جی حضور۔ درس قرآن شریف پڑھایا کرتے تھے۔ اور ایک مسجد کی امامت بھی تھی۔ سال میں جب دَورہ بکھرؒ کا ہوتا، تو اس مختصر دَورہ میں قاضی صاحب اَور سید نجف شاہ صاحب، اَور دیگر مخلصین آپ کو شاہپور لایا کرتے تھے۔ اور آپ کی آمد پر شاہپور کی رونق اتنی بڑھ جاتی کہ آدمی ہی آدمی نظر آتا اور اُیسے معلوم ہوتا تھا کہ تمام دُنیا آپ کی غلام ہے۔

ایک بار کا واقعہ ہے کہ آپ بیمار تھے۔ اور سوار نہیں ہو سکتے تھے۔ سید نجف

شاہ صاحب کا طریقہ عرض گزاری عجیب تھا۔ گلے میں پٹکا لٹکا لیتے تھے۔ اور ہاتھ جوڑ کر عرض گزار کرتے تھے چنانچہ حضورؒ کی خدمت اسی طرح عرض گزاری گئی کہ آپؒ ہمارے گھروں کو رونق بخشیں۔ اور یہ وقت ہوتا تھا، جبکہ ان کے بھائی گل محمد وغیرہ بھی تعطیلات کے لئے گھر آیا کرتے تھے۔ آپ نے بیماری کا عذر پیش کیا۔ لیکن شاہ صاحب نے عرض کیا کہ کشتی میں ہم آپ کو لے جائیں گے۔ کیونکہ بیربل اور شاہپور دونوں کے بالکل قریب دریا بہتا تھا۔ وفات کے بعد بھی مخلصینِ باوفا کی طرح بیربل شریف آتے رہتے تھے۔

لیکن جیسے ذکر کیا گیا۔ آپ کی اولاد سے کسی کے ساتھ تعلق نہ تھا۔ اور نہ ہی ان کو طریقت کے اہل خیال کرتے تھے۔ اور نہ ہی سجادہ نشین کا خیال ان کو ہوتا تھا۔ ان کے نزدیک صرف حضرتِ اقدسؒ کی ذات ہوتی تھی اور بس۔ آپ کی وفات کے بعد قاضی صاحب نے وفات پائی۔ ان کے صاحبزادے محمد خلیل صاحب ان کے جانشین ہوئے۔ اور ان کا عُرس بھی کیا کرتے ہیں۔ اور حضرتِ اعلےٰؒ کا بھی حسبِ عادت اپنے والدِ بزرگوار کی طرح عُرس کیا کرتے ہیں۔

خصوصی خدمت قاضی صاحب: جب کبھی آپ بیمار ہوتے تو قاضی صاحب پتہ چلنے پر فوراً حاضرِ خدمت ہوتے اور بول براز کی خدمت خود اپنے ہاتھوں سرانجام دیتے۔ اور اکثر حضرتؒ جب کبھی بیمار ہوتے، بیماری طویل ہوتی اور اکثر دو دو ماہ بیمار رہتے۔ اکثر عارضہ اسہال کا ہوتا۔ اور بہت زور سے۔

البتہ مرض الموت میں جبکہ حضرتؒ کو دو سال فالج رہا۔ حافظ قطب الدین خادم خدمت تھے۔

پیر سلطان سکندر شاہ صاحب خوشابی

پیر صاحب بیربل شریف کی درسگاہ میں میرے حضرت قبلہ والد صاحب رحمتہ اللہ علیہ سے ہی پڑھے تھے۔ ان کی تعلیم کا اندازہ معلوم نہیں کیا تھا۔ خوش شکل، خوش صورت، خوش سیرت، رنگ گورا، قابلِ دید تھے۔ سراسر متانت تھے۔ تبسم کبھی ہوتا تو زیرِ لب رہتا۔ ہمارے والد صاحب اور چچا صاحبان کے ساتھ محبت تھی۔ اور بیربل سے واپسی پر حضرات بادشاہؒ کے روضے کے بائیں جانب ایک روضہ کے اندر بیٹھے قرآن شریف پڑھا کرتے۔ بعد میں برآمدہ عمدہ

تیار ہونے پر برآمدہ میں تشریف فرماتے۔ بادشاہوں کی مسجد کی اِمامت پنجگانہ وہی ادا کیا کرتے تھے۔ صبح نماز سے پہلے آتے۔ اور عشاء کی نماز کے بعد گھر جاتے۔ دِن بھر یہاں قیام رہتا عام طور پر تعویذات والے اُن سے تعویذ کراتے۔ اپنا وقت قناعت سے گزارتے۔ حتّٰی کہ یہ یاد نہیں کہ کسی دوست کو دعوت دی ہو۔ بلکہ خوشاب کے لئے جو یہ مشہور ہے کشتی بھی تیار ہے، روٹی بھی تیار۔ یعنی چلتے بنو لیکن یہاں کچھ نہ تھا۔

ان کے صاحبزادے حکیم چن پیر صاحب کو مجھ سے بہت محبت تھی۔ وُہ میرے بھائی صاحب اَور حضرت قبلہ والد صاحب کے پاس پڑھا کرتے تھے۔ ویسے بھی ان کی خدمت اِس درویش کے خیال میں رہا کرتی تھی۔ لیکن یاد نہیں پڑتا کہ جب وقت گزرنے کے بعد وُہ مستقل زندگی بسر کرنے لگے۔ اَور مَیں بھی اپنے گھر مستقل رہائش پر آگیا۔ گاہ گزرتے ہوئے کھانے کے لئے کہا ہو۔ البتّہ ایک دو بار چائے اور شربت کی دعوت ہوئی۔

بہرصُورت قناعت ہی تھی۔ اَور کچھ آمدنی پیر صاحب کی نہ تھی۔ ایک عیال کے مالک تھے جَب آپ مرض الموت میں تھے، تو میں آپ کے گھر عیادت کے لئے حاضر ہوا، تو ایک تعویذ لینے والا بھی پاس تھا۔ فرمایا۔ وقت تو ٹھیک ہے۔ کبھی دس تعویذ لکھا کرتے تھے تو کوئی ایک پیسہ نہ دیتا تھا۔ اَب اس شخص نے ایک تعویذ کے دس رُوپے دئیے ہیں لیکن معلوم ہوتا، اَب چھوڑتے نہیں۔ وہی بات ہوئی۔ آپ کچھ وقت کے بعد وصال فرما گئے۔

چہرہ عجیب نورانی تھا۔ خاموش صفت اور دُنیا سے بے تعلق۔ حضرت قبلہ میاں صاحبؒ کی خدمت جَب مَیں حاضر ہوا تو سَب سے پہلے فرمایا سکندر شاہ صاحب کا کیا حال ہے۔ مَیں تو ایک دفعہ امرتسر بھی اُن کے ملنے کے لئے گیا تھا۔

میاں صاحبؒ کو پاک دل اور پاک صُورت کے ساتھ بڑی محبت تھی جس کو اس حال میں پاتے، اس پر دارفتہ ہو جاتے۔ جیسے ہم حسنِ ظاہریہ پر دارفتہ ہو جاتے ہیں۔ اَللّٰہُ اَکْبَر!

ـــــــ میں وفات پائی۔ اور اس برآمدہ کے زیر جہاں آپ مُصلّے پر بیٹھے قرآن شریف اور وظائف پڑھا کرتے،، دفن ہوئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

قاضی عطا محمدؒ صاحب نلی تحصیل خوشاب

قاضی صاحب کے والدِ بزرگوار قاضی نور محمدؒ صاحب جن کا سلسلۂ نسب، خاندان گگویہ اور خاندان علمائے جھاوریاں کے ساتھ ملتا ہے۔ وہ للہ شریف حضرت غلام نبی رحمۃ اللہ علیہ سے تعلق رکھتے تھے۔ مرید خاص تھے۔ اور ہمارے اقدسؒ کے پیر بھائی تھے حضرت اقدسؒ کی درس گاہ چونکہ مشہور ہو چکی تھی، ساتھ ہی طریقت کا بھائی چارہ تھا۔ اپنے عزیز قاضی عطا محمدؒ صاحب کو بھی بیربل چھوڑ آئے۔ میرے والد رحمۃ اللہ علیہ اس وقت صدر مدرّس تھے غرض جو کچھ پڑھا، وہیں پڑھا۔ محنتی تھے۔ لیکن طبع زیادہ تیز نہ تھی۔ حضرتِ اقدسؒ سے ہی بیعت ہو گئی۔ کچھ مدت آپ کی خدمتِ خاص میں رہے۔ مروّجہ نصاب کے پورے کرنے پر گھر چلے آئے۔ اور اپنے مشاغلِ دینی میں مصروف ہو گئے۔ حضرت صاحبؒ سے بڑی محبت تھی ایسے ہی حضرتؒ کو بھی ان سے محبتِ خاص تھی۔ اور خاص شفقت تھی۔

درسِ قرآن: قرآن شریف کا درس عمر بھر پڑھایا۔ اور نہایت پاک نیت سے درس کی خدمت کی۔ کئی حافظ کئے۔ لیکن سب سے نمایاں خصوصیت کہ جو بھی آپ کے زیرِ تعلیم رہا، اس کے اندر جذبۂ احترام بھر دیا۔

حضرتِ اعلیٰ کے نمونہ پر حلال و حرام میں بڑی تمیز فرماتے۔ اور اکثر شہر کی بدعنوانیوں پر احتجاجِ عملی فرمایا کرتے۔ مثلاً اغوا کردہ یا شدہ عورت مرجاتی تو اُس کا جنازہ کسی صورت بھی پڑھنا جائز نہیں خیال کرتے تھے۔ خود تو کسی صورت میں شامل نہ ہوتے۔ اگر کوئی پڑھ بھی لیتا تھا، تو وہ بھی احتساب میں آتا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا، کہ کبائر کے ارتکاب پر قاضی صاحب کا خوف غالب رہتا تھا۔

خود بھی صاحبِ تقویٰ تھے۔ مشتبہ اشیاء سے سخت پرہیز تھی۔ عموماً پرانی درس گاہوں کے طلباء میں اپنے استاد کا احترام کم دیکھا گیا۔ کیونکہ طلاب کی نظرِ تنقید میں وہ اُستاد کامیاب نہ ہوتے تھے۔ لیکن حضرت قاضی کی یہ صفتِ ورع و تقویٰ اتنا بلند تھا کہ کسی کو نقص و عیب پکڑنے کا موقعہ نہ ملتا تھا۔

استقامت: اس کے علاوہ استقامت اس درجہ تھی، کہ پہاڑ اپنی جگہ سے ہلنا ممکن

خیال نہیں کیا جا سکتا............ ایسے ہی ان کی استقامت بلند میں بھی کسی صورت تزلزل پیدا نہیں ہوا۔

تلّی: تلّی کا وقوع دامن پہاڑ کے نیچے ہے۔ اور اس کی زمین پہاڑی اور تھل کی ہے جہاں صرف بارشوں پر زندگی کا مدار ہے۔ لیکن سالوں جب بارش نہیں ہوتی، تو مخلوقِ خدا پر گزر اوقات تنگ ہو جاتی ہے۔ تو اِدھر اُدھر چل کر اپنا وقت گزارتی ہے۔ اور چند نفوس کے سوا تمام شہر خالی ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ اللہ کے بندے بدستور سابق اپنے طلباء کے ساتھ مسجد میں معتکف ہیں چنداں آمدنی بھی نہیں تھی۔ علاقہ مفلس تھا۔ زمینداری بھی کچھ زیادہ نہ تھی۔ اپنی زمین بھی صرف اپنے خانگی خرچ کے لئے بمشکل گزران کے قابل تھی۔ لیکن مسجد میں ایسے بیٹھے ہیں، جیسے انہیں کوئی پریشانی آئی نہیں۔ اور گھر سونے دانے سے بھرپور ہے۔

حضرتؒ کی آمد و رفت: جب کبھی حضورؒ سودھی اپنی ہمشیرہ کو ملنے کے لئے جاتے، یا کوئی سفر 'سون' کا درپیش ہوتا، تو قاضی صاحب کے اخلاص اور ان کی دعوت پر ضرور تشریف لاتے۔ اور اکثر دو روزہ قیام ہوتا۔

ایک ذکر: قاضی صاحب نے خود بیان کیا۔ کہ ایک بار آپ تشریف لائے۔ اور آپ خود نوافل پڑھنے میں مصروف ہو گئے۔ مجھے فرمایا۔ روٹی تیار کراؤ۔ میں گھر آیا۔ گھر میں کریلے تھے۔ وہی میں نے پکوائے۔ جب کھانا حاضر کیا، تو آپ خوش ہوئے فرمایا۔ آج گھر کی روٹی کھا رہا ہوں۔ بڑی خواہش کریلا کی تھی۔

خدمت: لنگر کی اکثر خدمت حسبِ ایماء فرمایا کرتے تھے۔ اکثر پتھر کی سلیں، وضو گاہ کے لئے یا کسی دوسری صورت کے لئے۔ چونا وغیرہ آپ کی خدمت ہوتی۔ ایک بار بھوسہ قاضی صاحب تیس تزنگڑ لے کر پتن پر پہنچے۔ ایک تزنگڑ ٹوٹ گیا۔ باقی انتیس تزنگڑ دریا سے کشتی کے ذریعے لے آئے۔ حضرتؒ کی دریافت پر بڑی خوشی سے عرض کیا کہ حضور انتیس تزنگڑ لایا ہوں۔ خیال تھا کہ حضرتِ اقدسؒ اِس خدمت پر حیران رہ جائیں گے۔ لیکن سنتے ہی آپ نے فرمایا۔ انتیس[۲۹] کیوں۔ ہم نے تو حضرت للّہیؒ کی خدمت میں تیس[۳۰] تزنگڑ بھیجے تھے۔ ایک میں کمی کیوں؟ اس وقت میں نے عرض کیا کہ گھر سے تو تیس[۳۰] آئے تھے۔

لیکن بتن پر ایک کھل گیا ہے ۔ فرمایا ۔ اچھا، پھر تو تیس ہو گئے ۔

فاصلہ: نلی بیربل شریف سے تقریباً بارہ کوس یا سولہ میل کے فاصلے پر ہے ۔ صحرا لق و دق تھا ۔ آنا جانا مشکل تھا ۔ عرسوں پر قاضی صاحب بمع اپنے درویشوں کے، ایک درویش کی صورت میں حاضر ہوتے تھے ۔ کبھی بیربل شریف میں دستار سر پر نہ رکھی تھی ۔

چال ڈھال: قاضی صاحب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ آپ اپنے پیر و مرشد کی ہر حرکت اور فعل کو سنّت کا درجہ دیتے تھے ۔ اور اپنے آپ کو اسی کے مطابق ڈھالے نظر آتے تھے ۔ دور سے جب کوئی ان کو آتا دیکھتا تھا، جب تک چہرہ پر نظر نہ پڑتی، تو بعینہ حضرتؒ کا تشخص معلوم ہوتا تھا ۔ پارجات مسنونہ اور جوتی وغیرہ، غرض حضر و سفر میں حضرتؒ کی تقلید سامنے تھی ۔

باطنی استعداد: حضرتِ اقدسؒ کی استعداد اتنی بلند تھی کہ مولوی محبوب عالم رحمتہ اللہ علیہ کے سوا کسی دوسرے شاگرد کی اتنی استعداد نہ تھی ۔ کہ حضرتؒ کا انعکاسِ اثر قبول کر سکے ۔ یہی وجہ ہے کہ حضرتؒ کی توجہ اپنے ملنے والوں پر خاص تو کجا، عام بھی نہ تھی جو کچھ کوئی مکھی کی طرح چوس گیا، چوس گیا ۔ کسی کی اپنی توجہ (باطنی کیفیت) سے پرورش نہیں فرمائی ۔ شہبازِ طریقت تھے ۔ کوئی شہبازِ طریقت آتا تھا تو پھر مہربانیوں کی بارش برستی ۔

اللہ تعالیٰ کا فضل: قاضی صاحب ہمیشہ حضرتؒ کی مہربانیوں کا ذکر کرتے ۔ اور فرمایا کرتے تھے کہ حضرتؒ کی نگاہِ لطف کے سہارے نلی میں بیٹھنا نصیب ہوا ۔ وہاں جم کر بیٹھنا میری طاقت سے باہر تھا ۔

قاضی صاحب جب اپنے علاقہ میں گئے تو چونکہ ثقہ عالم کوئی نہ تھا ۔ اور جو تھے بھی وہ روزی کے مارے اِدھر اُدھر چلتے رہتے تھے ۔ اس لئے للہ شریف اور خوشاب تک ان کا سکّہ چلتا تھا ۔ اور ان کے فتویٰ پر کوئی اُف نہ کرتا تھا ۔ صرف فتویٰ نہیں دیتے تھے، بلکہ اپنے فتویٰ کے مطابق عمل بھی کرایا کرتے تھے ۔ مثلاً ایک عورت کا نکاح اگر باطل یا فسخ قرار دیا ۔ تو اس وقت آرام نہیں کیا، جب تک اس کے گھر سے عورت کو اٹھوایا نہیں گیا ۔

ایک شکایت: حاجی مولوی میاں محمد صاحب سکنہ نوشہرہ بہت بڑے عالم تھے ۔ اور علاقہ

سُون کے مُفتی۔ وُہ بیال شریف کے اخلاص مند تھے۔ بعض وقت مولوی میاں محمّد صاحب، قاضی صاحب کے فتویٰ پر تنقید کر دیتے۔ جس کی وجہ سے قاضی صاحب کو کتبِ فقہ میں دوبارہ اُلٹ پلٹ کرنی پڑتی اور مطالعہ کرنا پڑتا۔

آپ نے حضرتِ اقدسؒ کی خدمت میں شکایت کی۔ مولوی میاں محمّد صاحب کی تنقید سے ہر وقت پریشان ہوں۔ ہر فتوے پر کچھ نہ کچھ لکھ دیتے ہیں۔ آپ نے فرمایا۔ وُہ آپ کے سَر پر محتسب ہیں تاکہ آپ کو غلطی نہ ہو۔ اور جو کچھ لکھیں، غور و خوض کے ساتھ لکھیں چونکہ قاضی صاحب کی طبیعت ذہین نہ تھی۔ اس لئے مطالعہ میں دِقّت آتی تھی۔ لیکن جوُں جوُں زمانہ گزُرتا گیا، ان کے فتووں کی عزّت بڑھتی گئی۔ اور ساتھ ہی کتبِ فقہ کا مطالعہ عام ہو گیا۔ یہاں تک کہ مولوی میاں محمد صاحب کے برابر عزّت و آبرو علاقہ میں ہو گئی۔ اور آپ کا فتویٰ کاہل دینداری پر شمار ہونے لگا۔

غرض تمام علاقہ کا دِینی مرکز تلّی ہو گئی۔ طریقت میں بھی سلسلہ شروع ہو گیا۔ خصوصاً آپنے شاگردوں کے ذریعہ عام دنیا میں مشہور ہو گئے۔ ہر شاگرد بھی آپ کا مُرید ہوا۔ پھر اُس کی نظر کسی دُوسرے پر نہ بیٹھی ؎

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سِکھائے کِس نے اِسماعیلؑ کو آدابِ فرزندی؟

حضرتِ اقدسؒ کے مخلصین اور شاگردوں کے دیکھنے کے بعد اس شعر کی حقیقت سامنے آجاتی۔ حضرت اقدسؒ کی وفات کے بعد بہت سال زندہ رہے۔ اور خدمتِ دین سر انجام دیتے ہوئے ۱۳۵۹ھ وفات پائی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ۔

معمہ لاینحل: حضرتِ اقدسؒ کے مُخلصین کے اولادِ نرینہ نہ تھی۔ جس کی وجہ آج تک میرے پر منکشف نہیں ہوئی۔ قاضی صاحب، سردار حاجی فتح خان صاحب اور حضرت محمّد شاہ صاحب قصوری کی بھی اولاد نہ تھی۔

کرامت: ایک بار حضرتِ اقدسؒ خانقاہِ معلّٰے سرکار قصوری حضور حضرت غلام محیؒ الدّین صاحب قیام پذیر تھے۔ معمول تھا کہ کئی روز، بعض وقت پندرہ پندرہ دِن قیام رہا کرتا

تھا کہ ایک دن حضورؒ نے فرمایا کہ آج تین۳ مخلصین کی اولاد کے لئے دعا کی گئی ہے۔ قاضی صاحب، حاجی صاحب، صاحبزادہ صاحب۔ چنانچہ دوسرے سال تمام کے لڑکے پیدا ہوتے قاضی صاحب کے لڑکے کا نام محمد رضا، حاجی صاحب کے لڑکے کا نام محمد یوسف اور صاحبزادہ صاحب نے اپنے لڑکے کا نام حاجی شاہ تجویز کیا۔

حالاتِ زندگی کا خلاصہ، بزبانی قاضی محمد رضا صاحبؒ

قاضی صاحب کی پیدائش ۱۲۸۱ھ میں ہوئی۔ چودہ۱۴ برس کی عمر تک گھر رہے اور قرآن مجید حفظ کیا۔ اور والدِ ماجد کی وفات کے بعد اپنی والدہ محترمہ کے ساتھ للہ شریف حضرتِ اعلیٰ مولانا و مرشدنا غلام نبی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور حضرتِ اعلٰی للہیؒ نے حضرت بیربلوی رحمۃ اللہ علیہ کے سپرد فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ یہ ہمارا لڑکا ہے۔ اس کی تربیت آپ کے ذمہ ہے۔

چونکہ میرے جدِ امجد قاضی نور محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی شادی للہ شریف حضرتِ اعلیٰؒ کے خاندان میں ہوئی تھی۔ بنابریں اپنی نسبتِ فرزندی سے نواز کر حضرتِ اعلٰے بیربلوی رحمۃ اللہ علیہ کے ۱۲۹۳ھ میں سپرد فرمایا۔ گیارہ سال حضرتِ اقدسؒ کی تربیت میں رہے اور رخصت پر فرمایا۔ نلی کی مسجد میں بیٹھ جائیں۔ اور قرآن مجید کا درس لانا پڑھانا اور کتبِ فقہ اور تصوف کا مطالعہ رکھنا۔ نیز باقی کردار کا بھی خیال رکھیں۔ اور مسجد سے ہرگز باہر نہ جانا۔ اس پر قاضی صاحب نے عرض کیا: قبلہ! نلی ایک سخت جگہ ہے۔ اگر اجازت ہو تو بندہ اپنا وقت آپ کی خدمت میں گزارے لیکن پھر حکم فرمایا کہ نہیں، نلی ہی جانا ہوگا۔ انشاء اللہ تمام کام مسجد میں سرانجام پائیں گے۔

غرض ۱۳۰۶ھ میں اجازت لے کر اپنے گھر قیام پذیر ہوئے۔ اور حسبِ ارشاد رفتار گفتار نشست و برخاست اور تمام ارشاداتِ عالیہ کے مطابق اپنی زندگی بسر کی۔ اور کسی قسم کا ادنےٰ فرق بھی آنے نہ دیا۔ شہر کے گلی کوچوں میں عام گزر نہ تھا۔ اپنے مصلّےٰ پر ہی بیٹھا کرتے۔ سخت سے سخت آدمی بھی مسجد میں حاضر ہو جاتا تھا۔

دن رات درسِ قرآن مجید اور نوافل و وظائف میں گزر جاتا تھا۔ نلی کے مشہور مجذوب بزرگ میاں بندی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں بھی جاتے تھے۔ ایک دن کوئی صاحب آپ کو اپنے ہمراہ لے گئے۔ تو میاں بندی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اپنا اپنا گھر اچھا ہے۔

۵۳ سال کی مدّت تک ایک جگہ قرآن مجید کی تعلیم دیتے ہوئے ۱۳۵۹ھ کو واصل بحق ہوئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

قاری اللہ بخش صاحبؒ سکنہ فیض پور کلاں تحصیل شرقپور شریف

قاری اللہ بخش صاحب بہت بڑے قد بالا کے بزرگ جوان تھے۔ ان کے والد صاحب بھی درس پڑھایا کرتے تھے۔ جب یہ جوان ہو گئے، تو اس وقت گھر میں تنگی بھی تھی۔ آپ کے والد بزرگوار قصور شریف میں بیعت تھے۔ لیکن قاری صاحب کو نقشبندیہ طریقہ ناپسند تھا۔ کیونکہ ان کے خیال میں یہ سلسلہ فقیرانہ ہے۔ ادعمر لیسر میں نہیں عسر میں گزرتی ہے۔ آپ کا خیال تھا، سلسلۂ چشتیہ میں داخل ہوں گے۔

لیکن اچانک یہ جوان قاری صاحب بمع ایک ہمراہی لاہور آگئے۔ واپسی پر ان کو معلوم ہوا کہ شرقپور شریف ایک بزرگ بہت بڑے آئے ہوئے ہیں۔ وہ چلے گئے۔

قاری صاحب کے بیان کے مطابق سننے کے بعد جب میرے ساتھی نے میری طرف حقہ کیا، تو میں نے کہا، جی نہیں چاہتا۔ اس نے دوبارہ سہ بارہ پیش کیا تو میں نے کہا، معلوم نہیں اب مجھے کیا ہو گیا۔ حقہ پینے کو جی نہیں چاہتا۔ یہ موذی لے جا۔ چنانچہ آرام لینے کے بعد جب میں فیض پور پہنچا، تو مجھے معلوم ہوا کہ یہ وہی فقیر نقشبندی آج مہمان ہیں۔ اس پر میں بہت حیران ہوا۔ گھر گیا تو معلوم ہوا، ہمارے مہمان ہیں۔ والد صاحب نے چاول گھر پکانے کے لئے کہہ دیا تھا۔ میں گھبرایا۔ مسجد میں آیا۔ اور حضرت کی تلاش میں تھا۔ چنانچہ جس کو میں اپنے خیال میں حضرتؒ سمجھتا رہا تھا۔ وہ خادم ہوتے۔ آخر صاحبزادہ محمد سعید صاحب نے میرا ہاتھ پکڑ کر حضرتؒ کے پیش کیا۔

آپ کی سادگی پر میں حیران ہو گیا۔ ایک فکر کہ گھر میں بادشاہ آئے۔ لیکن دعوت کے لئے کچھ پاس نہیں۔ اس پر حضرتؒ نے خود ہی فرمایا کہ مدت سے آرزو تھی کہ فیض پور میں قاریوں کا درس دیکھا جاوے۔ چنانچہ اس خیال سے ہم آپ کے مہمان ہوئے۔ حضرتِ اقدسؒ کو تدریسِ علوم دینیہ کے ساتھ خاص محبت تھی۔ جہاں جاتے، طلبہ سے قرآن شریف سنتے اور کتابی درس، جب جاتے تو طلبا سے ان کی کتاب سے سوال کرتے۔ اور جواب پا کر خوش ہوتے۔ علمی ذوق بہت بلند تھا۔ اتنے میں قاری صاحب کہتے ہیں کہ تھوڑی دیر بعد اذان ہوئی اور آپ وضو کے لئے اٹھے۔ اور میں جھٹ گھر گیا۔ گھر میں کچھ نقدی تو نہیں تھی۔ صرف

ایک لُنگی رواجی تھی۔ وہ میں بغل میں دبائے مسجد میں چلا آیا۔ اور وضو گاہ پر آپ اندھیرے میں تشریف فرما تھے۔ میں نے وہ لنگی پیشِ خدمت کر دی۔ ابھی میرے ہاتھ میں تھی کہ حضرتؒ نے احمد بخش کو جو کہ موجود تھا، فرمایا۔ یہ قاری صاحب کا تبرک ہے۔ پہلے اپنے ہاتھ قبول فرمائی۔ پھر اُسے دے دی۔ نماز ادا ہوئی۔ کھانا کھلایا گیا۔ لیکن پہلے میں نے عرض کر دیا تھا کہ کھانا حضور کم ہے، اور آدمی زیادہ۔ آپ نے فرمایا۔ بہت ہے۔ کچھ فکر نہ کریں۔ حضورؒ کی عادت مبارک تھی۔ جب کوئی کہتا کھانا کم ہے اور آدمی لنگر زیادہ۔ تو اکثر اوقات اپنی چادر دے دیتے اور فرماتے۔ کھانے پر ڈال دو اور تقسیم کرو۔ خود بھی ساتھ ہی بیٹھے بڑے سکون سے تناول فرماتے رہتے۔ یہاں تک کہ آدمی کھانا کھا چکتے اور دستر خوان خالی ہو جاتا تو بعض وقت یہ بھی فرما دیتے۔ کسی کو کھانا بھیجنا ہو تو بھیج دیں یا کسی کو کھلانا ہے تو کھلا لیویں جب تمام لینے دینے والے فارغ ہو جاتے تو آپ اپنا کپڑا اسمیٹ لیتے۔ پھر بھی جب دیکھا گیا تو چار آدمی کی روٹی ہوتی تھی۔

کرامت: ایک بار آپ نے پنڈی لالہ ضلع گجرات میں جمعہ پڑھایا۔ مخلوقات بہت زیادہ تھی رات کی روٹی کی کسی نے دعوت پیش نہ کی۔ مخلص امام بخش جو ہمارے میاں کرم دین کے والد تھے۔ اِس لاچاری میں حضرتؒ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ اور دعوت کی منظوری چاہی۔ آپ نے اجازت بخش دی۔ لیکن ان کو انبوہ کا خیال تھا۔ اسی وقت عرض کیا۔ کتنا آٹا گندھوایا جائے اور کتنی دال پکائی جائے۔ آپ نے فرمایا۔ پائی ڈیڑھ آٹا اور ایک ٹوپہ دال کافی ہے۔ چنانچہ یہی کچھ پکوایا گیا۔ لیکن اندر خوف، کیسے پورا ہوگا۔

لیکن پرانے مخلص امام بخش تھے۔ پھر عرض کیا۔ کھانا تیار ہے لیکن آدمی بہت ہیں۔ آپ نے فرمایا۔ کچھ فکر نہیں۔ تمام کھانا اپنے پاس رکھوایا۔ اور اپنی چادر مبارک اُوپر ڈالنے کے لئے دے دی تھی۔ پھر لنگر چلنے لگا۔ چوکیاں کھا کھا کر اُٹھتی جاتی تھیں لیکن کھانا بدستور بڑھ رہا تھا۔

آخر جب فراغت ہوئی تو آپ نے اپنی روٹی کھانی شروع کی۔ اور فرمایا ایسے موقع پر کھلانے کا لبن دین ہوتا ہے۔ اپنے تعلق والوں کو بھیج دو۔ چنانچہ حسبِ ارشاد پڑوسیوں

کو بھی بھیج دیا گیا۔ اور بعض کو کھلا دیا گیا۔ اور جب تمام کھا چکے تو عرض کیا گیا۔ آپ نے اپنی چادر اٹھانے کیلئے حکم دیا۔ لیکن ابھی کچھ دال اور کچھ روٹیاں بقایا بھی تھیں۔ حضرتؒ کی یہ کرامت عام تھی۔

ہاں، قاری صاحب جب کھانے سے فارغ ہو گئے تو حضرتؒ نے قرآنِ حکیم کے سننے سُنانے کا ارشاد فرمایا۔ بعض طلبائ نے کچھ آیات سنائیں۔ اور آپ کلام مجید کی قرأت سے زیادہ حظ اٹھایا کرتے تھے۔ اور اس حظ کا پتہ آپ کے چہرے سے نمایاں ہوتا تھا خود قاری صاحب کو بھی ارشاد ہوا۔ آپ نے بھی اپنے لب و لہجے سے قرآن شریف قرأت سے پڑھا۔ بہت پسند فرمایا۔ اس کے بعد قاری صاحب نے ایک تھال بتاشوں کا پیش کیا۔ حضورؒ نے فرمایا، یہ کیا۔ عرض کیا، بیعت چاہتا ہوں۔ آپ اپنے سلسلۂ عالیہ میں داخل فرمالیویں فرمایا، یہ سلسلہ نقشبندیہ دوسرے سلاسل کی طرح دولت نہیں رکھتا۔ یہاں سنگ لبیدن (پتھر چاٹنا) والا معاملہ ہے۔ آپ کو اس میں داخل ہو کر کیا حاصل۔ پتھر چاٹا کریں گے۔ قاری صاحب نے عرض کیا۔ اب میں سلسلہ میں داخل ہونا چاہتا ہوں۔ اور آپ سے بڑھ کر مجھے کوئی دکھائی نہیں دیتا۔ چنانچہ عام میں قاری صاحب کی بیعت ہوئی۔ اور ہر طرف سے مبارکباد کے نعرے اٹھے

بھوک کا خیال: بیعت کے بعد بھی میرے اندر سے بھوک کا بھوت نہ نکلا۔ بدستور یہ خیال غالب۔ بیعت تو ہو چکا۔ لیکن قرض کا کیا کروں۔ آخر دوسرے یا تیسرے دن جب میں حضورؒ کے ساتھ تھا۔ میں نے میاں احمد بخش سے کہا کہ حضرت کی خدمت میں عرض کرنا چاہتا ہوں چونکہ میاں احمد بخش حضورؒ کی طبیعت کے کامل واقف تھے۔ انہوں نے کہا کہ جب حضور سحری کو پاخانہ کے لئے تشریف لے جاویں تو پسِ پشت آہستہ چلتے جانا۔ اور جب پاخانہ سے فارغ ہو کر جناب واپس تشریف لا رہے ہوں، تو اپنی عرض کر دینا۔ چنانچہ جب فراغت کے بعد حضورؒ لوٹے تو اچانک حضرتؒ کی نظر مبارک قاری صاحب پر پڑی۔ دیکھتے ہی فرمایا۔ کیوں قاری صاحب؟

قاری صاحب نے اپنی تنگدستی کا تمام قصہ عرض کر دیا۔ والد صاحب فراخ دست ہیں۔ قرض لیتے رہے۔ اور قرض بڑھتا رہا۔ اب قرض کوئی مہاجن نہیں دیتا۔ آپ نے فرمایا اچھا۔ اب قرض بھی نہیں ملتا۔ ارشاد فرمایا۔ کھیتی کی جاوے۔ عرض کیا۔ کھیتی سے کیا ہوتا ہے

یہ تو عمر بھر بھی ہم سے ادا نہیں ہوتا۔ پھر فرمایا۔ کھیتی کی جائے۔ عرض کیا۔ کھیتی ہی نے تو ہمیں تباہ کیا۔ ایک نہیں دو جوڑے چار جوڑے رکھے۔ لیکن بھوک اور قرضہ بڑھتا گیا۔

اَب اس وقت اس ٹیلے پر تھے، جو ننکانہ دربار کے مغرب کی طرف تھا۔ اور آپ اس پر کھڑے تھے، جو یہ عرض معروض چل رہا۔ آپ بے اختیار اپنا عصا گھماتے جاتے تھے۔ فرماتے جاتے تھے۔ کہ قاری صاحب اس ٹیلے کے برابر دولت چاہیئے۔ اس ٹیلے کے برابر دولت چاہتے ہیں۔ آخر فرمایا۔ ایک جوگ (جوڑی بیل) کی کھیتی ضروری ہے۔

قاری صاحب فرمایا کرتے تھے۔ ایک جوگ کی واہی شروع کر دی۔ اور اس سال غلہ گندم اتنا آیا، جتنا چار جوگوں پر بھی نہیں آیا کرتا۔ اور اس پر مزید گندم مہنگی ہوئی اور سولہ ٹوپے کی جگہ چار ٹوپے فروخت ہوئی۔ چنانچہ اس سال میرا بہت سا قرضہ اُتر گیا۔

قاری صاحب اور بھی بہت کرامات سنایا کرتے تھے۔ باطن صاف تھے اور دین پسند۔ اس لیے ہمارے قبلہ حضرت میاں صاحب شرقپوریؒ کو بہت پسند تھے۔ اور اکثر حضرتؒ ان سے مل کر خوش ہوتے۔ پاکیزہ باطن کی وجہ بعض وقت حضرت میاں صاحبؒ سے بے تکلف بھی ہو جاتے۔ لیکن حضرتؒ کبھی ناراض نہ ہوتے، بلکہ خوش ہوتے۔ جس کی چند مثالیں لکھ دیتا ہوں۔

جامعہ مسجد شرقپوری کا تعمیری سلسلہ: حضرت میاں صاحبؒ کا معمول تھا کہ جب کسی مسجد کی تعمیر شروع کراتے، تو مزدور لگایا کرتے تھے۔ کسی خادم یا مخلص کو اجازت کارکردگی نہیں دیتے تھے۔ دو وقتہ کھانے کی بجائے، سہ وقتہ کھانا یا چہار وقتہ مستریوں اور مزدوروں کو دیتے تھے۔

ایک مخلص (جس کا نام مجھے یاد نہیں رہا) نے آپ کی اجازت لئے بغیر کام کرنا شروع کیا۔ اور ٹوکری اُٹھالی۔ دو چار دن کے بعد جب آپ کی نظر میں وہ مزدوروں کے ٹولے میں نظر آیا تو فرمایا۔ یہ کون ہے اور کس نے اُسے اجازت دی۔ نہایت ناراض ہوئے اور حکم دیا، باہر نکل جاؤ۔

قاری صاحب بھی اسی دن شرقپور شریف حاضر ہوئے۔ مسجد دیکھنے کے بعد حضرت قبلہؒ کی خدمت میں پہنچے تو فرمایا مسجد دیکھی۔ قاری صاحب نے عرض کیا۔ جی ہاں۔ اس کے بعد کہا کہ کیا آپ نے ثواب کا ٹھیکہ لے لیا ہے کہ کسی کو ثواب حاصل کرنے نہیں دیتے۔

آپ نے فرمایا۔ کیسے؟ عرض کیا۔ اِس بیچارے کو مسجد کے ثواب سے روک دیا۔ اب وہ بیٹھا روتا ہے۔ اِس کا جواب کون دے گا۔ نرم ہو گئے۔ اور فرمایا۔ کیا کہوں۔ لوگ دکھاوے کے لئے کام کرتے ہیں۔ اِس وجہ سے مَیں نے عوام کو روک دیا ہے۔ اگر وہ اِخلاص سے کام کرتا ہے، تو کرتا رہے۔

دُوسرا واقعہ: مسجد کی سطح بلند رکھنے کا خیال آپ کو تھا۔ اور اس سلسلہ میں آپ ایک منزل اوپر مسجد کو قائم کرنا چاہتے تھے۔ لیکن مخلصین نے کئی بار عرض کیا۔ بہتر ہے کہ نیچے منزل بنادی جائے اور دُوسری منزل پر مسجد ہو جائے۔ ورنہ مٹی کا خرچ بہت زیادہ ہو جائے گا۔ آپ کِسی کی نہیں مانتے تھے۔ قاری صاحب جب آئے تو مستری خادم سے قاری صاحب نے کہا۔ یہ کیا مٹی ڈلوا رہے ہو۔ مستری صاحب نے کہا حضرت میاں صاحبؒ نہیں مانتے۔ ہر چند کہا گیا۔ خرچ زیادہ ہوگا۔ لیکن آپ فرماتے ہیں، کچھ پرواہ نہیں۔

چنانچہ قاری صاحب خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا۔ اچھا ہوتا کہ مسجد کے دو حصے ہو جاتے۔ ایک نیچے اور ایک اُوپر۔ نچلے حصہ میں مراقبہ والے بیٹھ جاتے۔ یا آرام کرنے والے کر لیتے، سَرد خانہ ہو جاتا۔ آپ یہ سُن کر فرمانے لگے۔ قاری جی۔ کِسی نے پہلے یہ تجویز پیش نہیں کی۔ ورنہ یہ بات اور تجویز پسندیدہ ہے۔ چنانچہ اسی وقت مستری کو بُلوایا۔ قاری صاحب یہ تجویز کرتے ہیں۔ اِسی طرح تجویز کی جائے۔ یار لوگ بیٹھا کریں گے۔ مُراقب ہوں گے۔

حضرتِ اعلیٰ حضرت قبلہ میاں صاحبؒ کی نظر میں

حضرت قبلہ میاں صاحب رحمتہ اللہ علیہ کو حضرت بریلویؒ کے ساتھ دِلی اُلفت و محبّت تھی۔ چونکہ ہر دو حضراتؒ کی اِستعداد بہت بلند تھی۔ اور دونوں دونوں نسبتوں کے مالک تھے۔ تشریع و تکوین میں کامل استخراج۔ اور کوئی نسبت بھی ایک دُوسرے سے الگ نہ تھی اور دونوں دَشت بگریباں بھی ان پاک ہستیوں میں نہ تھی۔ اِس لئے ہر دو نسبتوں کے ساتھ دونوں بزرگوں کا یکساں تعلّق تھا۔ یہی وجہ تھی۔ حضرت قبلہ میاں صاحبؒ جب حضرتِ اعلیٰ بریلویؒ کا ذِکر سُنتے تو جھُوم جاتے۔ اور ہر موقع جب ذکرِ خیر آتا، تو بے اختیار محبّت کے الفاظ نکالتے۔

پہلی ملاقات: جب پہلی بار حضرت قبلہ میاں صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے شاہی مسجد میں حضرت رحمتہ اللہ علیہ بیربلوی کو دیکھا کہ آپ کھانا کھا رہے تھے۔ اور گھیا پکا تھا اور سالن شوربے والا تھا۔ آپ اپنی انگلیوں سے گھیئے کو تلاش فرما رہے تھے۔ تو جب کبھی حضرت قبلہ بیربلویؒ کا ذکر کرتے تھے، تو یہی صورت بیان فرماتے کہ ان کا کھانا اور کدو کے سالن، انگلیوں کے ٹھہرنے سے تو اُن کی وسعتِ ولایت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ یعنی دیکھ کر بھی یہی معلوم ہوتا کہ شہنشاہِ ولائت ہیں۔ جب میں خود حاضر ہوا، تو آپ نے یہی الفاظ دہرائے۔ مجھے دیکھ کر اتنی خوشی، کہ مخلصین سے خود فرمایا کرتے تھے۔ اور جب محبّت امنڈ آتی تو سینے لگاتے ہوئے فرماتے کہ تو تو باپ کا نور ہے۔ بار بار یہی الفاظ فرماتے۔ اللہُ اکبر، سچی محبّت یہی ہوتی ہے۔

یہ بھی فرمایا کرتے، جب سے حضرت صاحبؒ کو دیکھا تو حضرتؒ کی صورت میرے دل میں بیٹھ گئی۔ اور ہر وقت حاضر۔ اِس محبّت نے ایک بار اپنے مرشد کے سامنے بے اختیار حضرتؒ کے اوصاف شروع کر دئیے۔ پیرو مرشد نے فرمایا۔ میاں شیر محمد، اپنے پیر کے سامنے کسی دوسرے بزرگ کا ذکر کرنا اچھا نہیں ہوتا (کیونکہ بزرگ کو اپنے مرید سے کسی کی تعریف سننے سے غیرت پیدا ہوتی ہے)، تو آپ نے بے ساختہ فرمایا۔ کہ دریا کو دریا کہنا کون سی بے ادبی ہے۔ اِس پر حضرت امیر الدینؒ خاموش ہو گئے۔

قاری اللہ بخش صاحب کی ذاتی صلاحیت بھی ضرور تھی۔ لیکن ان کو اور صوفی محمد ابراہیم صاحب کو جو درجۂ قربِ حضرت میاں صاحبؒ سے حاصل تھا۔ وہ دنیائے یارانِ طریقت جانتے ہیں، کسی کو نہ تھا۔ آخر اس کی وجہ صرف صلاحیتِ ذاتی نہ تھی، بلکہ حضرت قبلہ بیربلویؒ کی محبّت و اُنس ذاتی کی وجہ سے تھا۔

غرض جو بھی حضرت میاں صاحبؒ کی خدمت میں حضرت بیربلویؒ کا تعلق دار گیا، اسی پر وارفتہ ہو جاتے۔ انقلاب میں لکھا گیا کہ خیرپوال کا ایک موچی حضرت میاں صاحبؒ کی خدمت میں گیا۔ آپ نے جب دریافت کیا۔ میاں کس سے ملتے ہو؟ تو اُس نے حضرتؒ کا نام لیا۔ آپ بے اختیار ہو گئے۔ آپ کو اِن آنکھوں سے دیکھا تھا۔ عرض کیا۔ جی ہاں۔

پھر فرمایا، دیکھا تھا؟ اس نے عرض کی۔ جی حضور۔ فرمایا، پھر یہ کیا (یعنی وضع قطع سنّت کے مطابق نہیں اور داڑھی تراشیدہ ہے)۔ اِس پر آپ کو سخت قلق ہوا۔ جس کی وجہ سے اس بیچارے پر پریشانی وارِد ہو گئی۔

اکثر یارانِ طریقت سے فرمایا کرتے، کہ حضرتؒ کے روضہ پر جایا کرو خصوصاً ان لوگوں کو جو اس علاقہ کے رہنے والے ہوتے۔

ایک بار مولوی عبدالرّسول صاحب خوُرد جن کا تعلّق حضرت میاں صاحبؒ سے تھا حاضری سے پہلے حضرتؒ کے روضہ پر آئے۔ فاتحہ پڑھا۔ پھر شرقپور حاضر ہوئے۔ حاضر ہوئے تو فرمایا آج تو تمہارے سے حضرت مرتضےٰ صاحبؒ کی بُو آرہی ہے۔

مَولوی نوُر محمدؒ چاندپوری یا ان کے تعلّق والے بھائی ایک بار حضرت کی خدمت حاضر ہوئے اُور خیال میں آیا۔ جو بھی حضرت کی خِدمت میں آتا ہے، اس پر حال وارِد ہو جاتا ہے۔ مَیں کتنی بار آیا اور کچھ نہ ہوا۔ آپ نے جھٹ جواب دیا کہ میاں سب کچھ ہو سکتا ہے۔ لیکن اَدب بھی تو چاہیئے۔ یعنی حضرتِ اعلیٰ بریلویؒ کا ادب ملحوظ رہے۔ اِس اشتیاق و محبّت کے ایک دو اور واقعے صوفی چراغ دین صاحب کے ذکر میں پیش کروں گا۔

آمدم بسِلسلۂ سابقہ ذِکر قاری صاحب

ایک بار مَیں قاری صاحب کے ہمراہ فیض پور جا رہا تھا۔ جب گاؤں قریب آ گیا، میری نظر دور تک اس وقت جاتی تھی۔ تو ایک حسِینہ عورت دروازے پر کھڑی نظر آئی اُور ہم چلتے جاتے تھے۔ جب کچھ قریب آئے، تو عُورت اندر چلی گئی۔

خُوبصورت چہرے نہیں ہوتے اور جس کی ادائیں بھی دُور سے جھلکتی ہوں لیکن میرے دِل میں یہ کھٹکا اس وقت آ گیا کہ یہ عورت کیوں اندر چلی گئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ قاری صاحب کے خوف سے چلی گئی ہے۔ ورنہ حُسن و جمال چھُپنا کیسے پسند کرتا ہے۔ آخر مَیں نے دریافت کیا۔ تو کہا۔ رنڈی تھی۔ پُرانے رسوم کے مطابق بعض قصبوں میں گانے والی رہا کرتی تھیں نوراً قاری صاحب کے حقیقی نیک ہونے پر توجہ ہو گئی۔ کہ ذرا بھی ان کے اخلاص و محبّتِ دینی اُور غیرت میں کمی ہوتی تو یہ اتنا خوف عورت نہ کھاتی۔ اور یہی غیرتِ دینی تھی، جس کی وجہ سے

حضرتِ اعلیٰ بیربلوی اور حضرت قبلہ میاں صاحبؒ ان کو سچا آدمی خیال کرتے ۔ اور اُن پر مہربانی فرماتے ۔

اِمتحان : ہر ایک آدمی کی آزمائش ضروری ہے ۔ اور ہر ایک کا کسی وقت امتحان ہوجانا کیونکہ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ قرآنِ حکیم میں کھُلے الفاظ میں موجود ہے ۔

قاری صاحب کی غیرتِ دینی مشہور تھی ۔ اور بُرے اور مکار آدمی سے دِلی نفرت تھی

قاری صاحب کے چھوٹے لڑکے قاری غلام رسُول کو بیماری لاحق ہوگئی ۔ وُہ بیٹھے بیٹھے بیہوش ہوجاتے تھے ۔ قاری صاحب نے دم کرائے ۔ تعویذ گنڈے لئے لیکن

ع مرض بڑھتا گیا ، جوں جوں دوا کی

آخر کسی نے قاری صاحب کو کہا ۔ یہ جن ہے اور بھُوت ہے ۔ اِس کے نکالنے والے چوہڑے ہوتے ہیں ۔ وہ ڈھولکی بجاتے ہیں ، اور گیت گاتے ہیں ۔ چنانچہ جب کوئی طریقہ نہ رہا تو اسی پر اتر آئے ۔ حالانکہ جب کبھی میری ان کی ملاقات ہوتی تھی ، تو مَیں یہی کہتا تھا ۔ بیمار ہے علاج چاہیئے ۔ علاج کی طرف توجہ نہ دیتے ۔ اُن کے دل میں یہ بیٹھ گیا ۔ جن ہے ۔ آخر کسی کے ذریعہ ان چوہڑوں کو بلوایا ۔ بچے کو سامنے بٹھا ، انہوں نے ڈھولک اور گیتوں سے پہلے حال ڈلوایا ، پھر جن بھوت کو باہر کیا ۔ اور قدرتِ خُدا آرام وسکون بھی ہوگیا ۔ اور جب میں حاضر ہوا ، اور مجھے ملے ۔ تو خود کہا کہ غلام رسول کو جن تھا ۔ اور اِسی طرح چلا گیا ۔ میں نے پھر یہی کہا کہ وُہ بیمار تھا فرمایا نہیں ۔ اَب کُلی آرام ہے ۔ لیکن کچھ مدت کے بعد پھر بیمار ہوگیا ۔ قاری صاحب بھی بیمار تھے ۔ مَیں فیض پور گیا ۔ حکیم فتح محمد ، حضرت میاں صاحبؒ کے ایک خادِم میرے ہمراہ تھے ۔ انہوں نے کہا کہ میں قاری صاحب کا اور غلام رسول صاحب کا علاج کرتا ہوں ۔ چنانچہ قاری غلام رسول صاحب کو اس نے جلاب شروع کئے اور غالباً قاری صاحب کا بھی یہی علاج تجویز کیا ۔ قاری صاحب تو ہمیشہ کے لئے ہم سے دُور ہوگئے ۔ لیکن غلام رسول ہمیشہ کے لئے اِس علاج سے صحت یاب ہوگیا ۔ کیونکہ بلغم اندرون رگ و ریشہ چلی گئی تھی ۔ کثیر جلابوں سے مادہ خارج ہوگیا ۔

مرض کی ابتداء دریافت کی گئی تو معلوم ہوا کہ کسی وقت قاری غلام رسول نے مُولی کھائی تھی ۔ اس پر لسی پی لی ۔ اَب صاف راز کھُل گیا کہ کیوں مرض پیدا ہوئی تھی ۔

بہرصورت بہت نیک آدمی تھے۔ اور اپنا نمونہ آپ تھے۔ حضرتؒ کی نظر پاک تھی۔ جس پر پڑی، وہی پکا ایماندار ہو گیا۔ اور پھر عمر بھر کسی فرقہ کی طرف متوجّہ نہ ہوا۔ اپنے پرانے دین پر قائم رہا۔

اولاد: اپنی اولاد کا ان کو اکثر فکر رہتا تھا۔ بڑے لڑکے قاری نور الحسن کو حضرت میاں صاحب رحمتہ اللہ علیہ سے بیعت کرایا تھا۔ حضرتؒ فرمایا کرتے تھے، موسوی مشرب ہے۔ سادہ آدمی تھے لیکن بفضلہٖ کچھ نہ کچھ کام چل رہا ہے۔ دوسرے لڑکے غلام رسول تھے۔ وہ اپنے پرانے اصلی وطن جندرالہ میں مقیم ہیں۔

صوفی محمدؐ ابراہیم صاحبؒ قصوری

حضرت قبلہ اپنے پیر و مرشد حضرت غلام محی الدّین صاحب قصوریؒ کے مزار پر جب کبھی جاتے تھے تو کئی کئی دن قیام رہتا تھا۔ اکثر ہفتہ عشرہ سے زیادہ ہوتا۔

ویسے بھی وہ سرزمین اُس وقت مردانِ کامل سے خالی تھی۔ اِس لئے حضرتِ اعلیٰ بیربلویؒ اپنے سلسلہ میں منفرد ہستی تھیں۔ کوئی دوسرا ایسا برابر کا تھا۔ پھر قصور شریف کا خطۂ پاک، جو ہمیشہ سے طریقت کا مرکز چلا آیا۔ کیونکر طریقت کی پیاس سے خالی رہ سکتا تھا۔

چنانچہ حضرتِ اعلیٰ بیربلوی رحمتہ اللہ علیہ کا عروج کمال پر ہوا۔ اور زائرین مرد و زن کا قبرستان تک تانتا بندھا رہتا تھا۔ خصوصاً صبح و شام ایک دنیا آتی جاتی تھی۔ چونکہ قبرستان خاصہ تقریباً میل سے زیادہ تھا۔ اِس لئے یہ سلسلہ لمبی قطار میں نظر آتا تھا۔

حاجی حبیبؒ اللہ صاحبؒ: حاجی حبیب اللہ صاحب کے خاندان کے اکثر افراد، جو گورے کہلاتے تھے، آپ کے سلسلۂ عالیہ میں داخل ہو گئے۔

لنگر خانہ کا انتظام: حاجی صاحب کے تینوں بھائی بھی ان کے پیر بھائی تھے۔ وہ اپنے اپنے کارخانوں اور منڈی میں مصروف رہتے۔ حاجی صاحب تمام کے ذمہ دار تھے۔ لنگر کا انتظام خانقاہ معلّٰے میں ہی تقسیم ہوتا۔ آپ بمع خدّام شہر میں نہ آتے۔ شب و روز وہیں مقیم رہتے۔

بیعت: حضرت صوفی صاحب کو ابتدائے طریقت کے ساتھ مناسبت تھی۔ اور اکثر خانقاہوں پر جانے کا معمول تھا۔ مراقبہ میں یا خواب میں ان کو معلوم ہوا تھا، کہ تمہارا پیر حافظ و عالم اور قاری

ہوں گے۔ جب آپؒ قصور تشریف لے گئے، تو طبیعت میں سکون و آرام ہو گیا۔ اور دل نے بیعت کرنا چاہی۔ لیکن سوال ذہن میں یہ آیا، کہ عالم تو ہیں، کیا حافظ، قاری بھی ہوں گے۔ جب صوفی صاحب نے دریافت کیا، تو معلوم ہوا کہ حافظ بھی ہیں۔ لیکن ابھی قاری ہونے کا پتہ نہ تھا۔ آخر خود حضرت نے فرمایا کہ تجویدی علم تو جانتا ہوں، لیکن پڑھ نہیں سکتا جس سے صوفی صاحب کے شکوک دور ہو گئے۔ اور اب حضرتِ اعلیٰ رحمۃ اللہ علیہ کی بیعت ہو گئے۔ صوفی صاحب لمبے قد اور ستھرے چہرے کے مالک تھے طبیعت نہایت موزوں پائی تھی۔ گفتگو نہایت نرم ہوتی۔ اور فضولیات سے محتاط عادت تھی۔ غرض ایک صوفی میں جتنی خوبیاں ہونی چاہئیں۔ اتنی خوبیوں کے مالک تھے اور کپنی بانی کرتے تھے۔ دونوں کام بیک وقت ایسے نبھائے کہ صوفی کی صوفیت زندۂ جاوید بن گئی اور نیک نہاد صوفی کی صورت میں جلوہ گر ہو گئے۔

حضرتِ اعلیٰ بیربلوی نور اللہ مرقدہٗ کے وصال کے بعد جب صوفی محمد ابراہیم صاحب فاتحہ کے لئے بیربل آئے تو اس وقت حضرت قبلہ میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی ساتھ تھے۔ غالباً یہ قافلہ تین ۳ آدمی کا تھا۔ لیکن کسی کو یہ معلوم نہ تھا، کہ ان میں ایک ایسا شاہبازِ طریقت ہے جس سے دنیا ہدایت پائے گی۔

حضرت قبلہ میاں صاحبؒ بھی ان ایام میں زیادہ تر قصور شریف رہا کرتے تھے۔ دونوں بزرگوں میں نسبتِ اتحاد کامل تھی یہی وجہ تھی، کہ وہ حضرت صوفی صاحب کے ساتھ میاں صاحب بھی تشریف لے گئے۔ ویسے حضرتِ اعلیٰؒ کے زخم خوردۂ محبت بھی تھے۔ اور ہمیشہ حضرت بیربلویؒ کی یاد تذکروں میں زندہ رکھا کرتے تھے۔ حضرت صوفی صاحب سے اکثر حالات حضرت بیربلوی کے سنتے رہتے تھے۔ اور حضرت بیربلویؒ کے حالات سے اتنا شغف ہو گیا تھا۔ کہ حضرت بیربلویؒ کے ہر منسلک سے آپ کے حال و قال سننے کی استدعا ہوتی تھی۔

اتحادی نسبت: حضرت قبلہ میاں صاحبؒ کو صوفی صاحب سے دلی محبت تھی۔ ان کی صورت و سیرت آپ کو پسند تھی۔ کچھ حضرت بیربلوی رحمۃ اللہ علیہ کی وجہ سے زیادہ پیار کیا کرتے تھے۔ لیکن یہ پیار و محبت برابر بڑھتی رہی۔ اور جب حضرت قبلہ میاں صاحبؒ کی ولایت کا آفتاب

بہرصورت بہت نیک آدمی تھے۔ اور اپنا نمونہ آپ تھے۔ حضرتؒ کی نظر پاک تھی۔ جس پر پڑی، وہی پکا ایماندار ہوگیا۔ اور پھر عُمر بھر کسی فرقہ کی طرف متوجہ نہ ہوا۔ اپنے پُرانے دین پر قائم رہا۔

اولاد: اپنی اولاد کا ان کو اکثر فکر رہتا تھا۔ بڑے لڑکے قاری نور الحسن کو حضرت میاں صاحب رحمتہ اللہ علیہ سے بیعت کرایا تھا۔ حضرتؒ فرمایا کرتے تھے، مُوسوی مشرب ہے۔ سادہ آدمی تھے لیکن بفضلہٖ کچھ نہ کچھ کام چل رہا ہے۔ دُوسرے لڑکے غلام رسول تھے۔ وُہ اپنے پرانے اصلی وطن جندرالہ میں مقیم ہیں۔

صُوفی محمدؐ ابراہیم صاحبؒ قصوری۔

حضرت قبلہ اپنے پیر و مرشد حضرت علام محی الدّین صاحب قصوریؒ کے مزار پر جب کبھی جاتے تھے تو کئی کئی دن قیام رہتا تھا۔ اکثر ہفتہ عشرہ سے زیادہ ہوتا۔

ویسے بھی وہ سرزمین اُس وقت مردانِ کامل سے خالی تھی۔ اِس لئے حضرتِ اعلیٰ پیر بلویؒ اپنے سلسلہ میں منفرد ہستی تھیں۔ کوئی دُوسرا برابر کا تھا۔ پھر قصور شریف کا خطہّ پاک، جو ہمیشہ سے طریقت کا مرکز چلا آیا۔ کیونکر طریقت کی پیاس سے خالی رہ سکتا تھا۔

چنانچہ حضرتِ اعلیٰ پیر بلوی رحمتہ اللہ علیہ کا عروج کمال پر ہوا۔ اور زائرین مرد و زن کا قبرستان تک تانتا بندھا رہتا تھا۔ خصوصاً صبح و شام ایک دنیا آتی جاتی تھی۔ چُونکہ قبرستان خاصہ تقریباً میل سے زیادہ تھا۔ اِس لئے یہ سلسلہ لمبی قطار میں نظر آتا تھا۔

حاجی حبیب اللہ صاحبؒ: حاجی حبیب اللہ صاحب کے خاندان کے اکثر افراد، جو گورے کہلاتے تھے، آپ کے سلسلۂ عالیہ میں داخل ہوگئے۔

لنگر خانہ کا انتظام: حاجی صاحب کے تینوں بھائی بھی ان کے پیر بھائی تھے۔ وُہ اپنے اپنے کارخانوں اور منڈی میں مصروف رہتے۔ حاجی صاحب تمام کے ذمہ دار تھے۔ لنگر کا انتظام خانقاہ معلےٰ میں ہی تقسیم ہوتا۔ آپ بمع خدّام شہر میں نہ آتے۔ شب و روز وہیں مقیم رہتے۔

بیعت: حضرت صوفی صاحب کو ابتدائً طریقت کے ساتھ مناسبت تھی۔ اور اکثر خانقاہوں پر جانے کا معمول تھا۔ مراقبہ میں یا خواب میں ان کو معلوم ہوا تھا، کہ تمہارا پیر حافظ دعالم اور قاری

Marfat.com

ہوں گے۔ جب آپؒ قصور تشریف لے گئے، تو طبیعت میں سکون و آرام ہو گیا۔ اور دل نے بیعت کرنا چاہی۔ لیکن سوال ذہن میں یہ آیا، کہ عالم تو ہیں، کیا حافظ، قاری بھی ہوں گے۔ جب صوفی صاحب نے دریافت کیا، تو معلوم ہوا کہ حافظ بھی ہیں۔ لیکن ابھی قاری ہونے کا پتہ نہ تھا۔ آخر خود حضرت نے فرمایا کہ تجویدی علم تو جانتا ہوں، لیکن پڑھ نہیں سکتا جس سے صوفی صاحب کے شکوک دُور ہو گئے۔ اور اب حضرتِ اعلیٰ رحمتہ اللہ علیہ کی بیعت ہو گئے۔ صوفی صاحب لمبے قد اور ستھرے چہرے کے مالک تھے۔ طبیعت نہایت موزوں پائی تھی۔ گفتگو نہایت نرم ہوتی۔ اور فضولیات سے محتاط عادت تھی۔ غرض ایک صوفی میں جتنی خوبیاں ہونی چاہیئں۔ اتنی خوبیوں کے مالک تھے، اور نفی باقی کرتے تھے۔ دونوں کام یک وقت ایسے نبھائے کہ صوفی کی صوفیت زندۂ جاوید بن گئی اور نیک نہاد صوفی کی صورت میں جلوہ گر ہو گئے۔

حضرتِ اعلیٰ بیربلوی نور اللہ مرقدہٗ کے وصال کے بعد جب صوفی محمد ابراہیم صاحب فاتحہ کے لئے بیربل آئے تو اس وقت حضرت قبلہ میاں صاحب رحمتہ اللہ علیہ بھی ساتھ تھے۔ غالباً یہ قافلہ تین ۳ آدمی کا تھا۔ لیکن کسی کو یہ معلوم نہ تھا، کہ ان میں ایک ایسا شہبازِ طریقت ہے جس سے دُنیا ہدایت پائے گی۔

حضرت قبلہ میاں صاحبؒ بھی ان ایام میں زیادہ تر قصور شریف رہا کرتے تھے۔ دونوں بزرگوں میں نسبتِ اتحاد کامل تھی یہی وجہ تھی، کہ وُہ حضرت صوفی صاحب کے ساتھ میاں صاحب بھی تشریف لے گئے۔ وَیسے حضرتِ اعلیٰؒ کے زخم خوردہ محبت بھی تھے۔ اور ہمیشہ حضرت بیربلویؒ کی یاد تذکروں میں زندہ رکھا کرتے تھے۔ حضرت صوفی صاحب سے اکثر حالات حضرت بیربلوی کے سنتے رہتے تھے۔ اور حضرت بیربلویؒ کے حالات سے اتنا شغف ہو گیا تھا۔ کہ حضرت بیربلویؒ کے ہر منسلک سے آپ کے حال و قال سُننے کی اِستدعا ہوتی تھی۔

اتحادی نسبت: حضرت قبلہ میاں صاحبؒ کو صوفی صاحب سے دلی محبت تھی۔ ان کی صورت وسیرت آپ کو پسند تھی۔ کچھ حضرت بیربلوی رحمتہ اللہ علیہ کی وجہ سے زیادہ پیار کیا کرتے تھے۔ لیکن یہ پیار و محبت برابر بڑھتی رہی۔ اور جب حضرت قبلہ میاں صاحبؒ کی ولائت کا آفتاب

نصفُ النّہار تک پہنچا، تو وہی پہلی محبّت اور پہلی عزّت و شرف۔ اور پہلا سا حال ہی مابین رہا۔ کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔ جب صوفی صاحب آجاتے تھے تو حضرتؒ کا چہرہ خنداں ہو جاتا تھا۔ اور صوفی صاحب کی ہر ادا پسند تھی۔ بے تکلّف دوست تھے۔ شاہ و گدا اس محبّت میں ایک پیالہ محبّت پی رہے ہوتے تھے۔

خدمت: ہمارے خاندان سے جو بھی قصور شریف حاضر ہوتا تھا، صوفی صاحب ہی کھانے کا انتظام حاجی حبیبُ اللہ کے ہاں کراتے۔ موصوف جس طرح زندگی حضرت اعلیٰ رحمتہ اللہ علیہ کے وقت انتظام لنگر اپنے ذمّے رکھتے، بعینہٖ اسی طرح جب تک وہ زندہ رہے اپنے گھر سے کھانا بھجواتے تھے۔ صرف اطلاع صوفی صاحب کے ذمّہ تھی۔

جب میں بغرض تلاش و عقیدت ایک بار حاضر خدمت حضرت سید محمد صاحبؒ رحمتہ اللہ علیہ ہوا، تو آپ کی مسجد کے قریب طویلہ پر رہائش تھی۔ نیچے گھوڑوں کا طویلا تھا اور اوپر حضرتؒ کی رہائش تھی۔ صاحبزادہ صاحب نے صوفی صاحب کو اطلاع کر دی اور انہوں نے حاجی صاحب کے پاس آدمی بھیج دیا۔ غالباً دو دن قیام رہا۔ پھر میں سرھند شریف چلا گیا۔

ایک بار غالباً سنہ ۱۹۱۴ء میں مارشل لاء سے پہلے جب فساد ہوئے تو میں پشاور اسلامیہ کالج میں ملازم تھا۔ اپریل کی رخصتوں میں جب کئی پروفیسروں کے ساتھ گاڑی میں سوار ہوئے تو گوروں سے جھڑپ ہو گئی۔ باوجودیکہ پولیس کو اطلاع دی گئی لیکن کسی پولیس آفیسر کو دست اندازی کے خلاف سامنے ہونے کی ہمّت نہ ہوئی۔

لیکن لاہور پہنچا تو گوجرانوالہ میں فساد ہو چکا تھا۔ دو دن کے قیام کے بعد میں قصور شریف پہنچ گیا۔ حیران ہوں، جوان آدمی میں کتنی ہمّت ہوتی ہے۔ مجھے مارشل لاء سے کچھ خوف نہ ہوا۔ میرے چچا حضرت محمد سعید صاحب، حاجی صاحب کے رشتہ دار کارخانہ دار کے مہمان تھے۔ اعلیٰحضرتؒ کے وہ مرید تھے۔ مجھے اپنے ساتھ لے گئے۔ لیکن بعد دوپہر وہاں بھی فساد ہو گیا۔ ریل کے انجنوں کو خراب کرنے کی کوشش کی گئی۔ ہوائی جہاز آنے جانے شروع ہوئے۔ اس وقت ہوائی جہاز ملک میں بہت کم تھے۔

دوسرے دن ان کے ذریعے ٹکٹ لاہور کے مل گئے اور اس وقت عام

Marfat.com

شہریوں کو سٹیشن پر تفتیش کے لیئے لا رہے تھے۔ لیکن مجھے کوئی ہوش نہ آئی۔ لاہور چچا محمّد سعید صاحب کے ساتھ پہنچا۔ وہ تو بذریعہ ٹم ٹم شرقپور شریف کے راستہ گھر دا خل ہوئے میں بلا ٹکٹ کے گجرات پہنچ گیا۔ وہاں فساد زوروں پر تھا۔

پھر اپنے مطلب کی طرف چلتا ہوں۔ صوفی صاحب ان دنوں قصور شریف کے ایک مشہور صوفی تھے۔ اور ہر آدمی ان کی عزت کرتا تھا۔ وُہ کنی بانی بھی کرتے اور اسی وقت خادموں کو توجّہ بھی دیتے تھے۔

پھر بھی دوبارہ میں ایک بار شرقپور شریف گیا اور مسجد حاجی رانجھا والی میں مقیم رہا۔ اور صوفی صاحب اور ان کے مُرید حافظ غلام حسین خدمت گزار تھے تیسری دفعہ جب حاضر ہوا تو صوفی صاحب کو اپنا عندیہ کھُلے طور پر عرض کر دیا گیا کہ دعا کریں، کہ کوئی بزرگ مِل جائے، جس پر میری طبیعت بیٹھ جائے۔ چنانچہ واپسی پر حضرتؒ کی خدمت میں حاضری ہو گئی۔ اور وہیں کا ہو کر رہ گیا۔

شرقپور کی حاضری پر: ایک بار جب میں حاضر ہوا، تو رخصت اور اجازت جب چاہی، تو حضرت قبلہ رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا۔ کیا جلدی ہے؟ عرض کیا۔ جمعہ گھر ادا کرنے کا خیال ہے۔ فرمایا، کیا یہاں جمعہ نہیں ہوتا؟ غالباً ہفتہ یا اتوار صوفی صاحب تشریف لائے اور جب ملاقات کے لیئے بالاخانہ پر صوفی صاحب چلے گئے تو آپ نے دیکھتے ہی صوفی صاحب کو کہا کہ صاجزادہ صاحب کو ملے۔ غالباً میں اندر بیٹھا تھا۔ آپ نے فرمایا۔ جاؤ اُن سے ملو۔ وُہ آئے، ملے۔ بعد جب آپ تشریف لائے، تو فرمایا۔ چاہا تھا کہ صوفی صاحب سے تمہاری ملاقات ہو جائے۔

آپ میری حاضری سے بہت خوش تھے، اور رہے۔ آپ کا خیال تھا بیربل شریف کی خانقاہ از سرِ نو زندہ ہو۔ اور اسی خیال سے آپ مہربان ہوئے۔

صُوفی صاحب باوجود اَن پڑھ ہونے کے معلوماتِ تصوّف کا خزینہ تھے۔ اسی وجہ سے آپ حضرت میاں صاحب رحمتہ اللہ علیہ کی وفات کے بعد ایک دفترِ بے پایاں حضرت میاں صاحبؒ کے حالات کا لکھ دیا۔ جس کی ترتیب کا مجھے شرف حاصِل ہے۔

آنحضرتؒ کی وفات کے بعد جب قصور حاضر ہوا، تو آپ نے مجھے کہا کہ میں نے کچھ لکھا تو ہے، لیکن اس کی تصحیح اور ترتیب کے لئے کوئی لکھا پڑھا اور نہیں ملتا چنانچہ میں نے کہا میں حاضر ہوں۔ میں مسودہ گھر لے آیا۔ کچھ زیادہ ترتیب نہ دے سکا کیونکہ میرے قابو سے تمام تحریر باہر تھی۔ البتّہ ہر باب کے ابتدائیہ میں نوٹ کچھ دے دیئے گئے۔ اور کچھ عنوانات لکھ دیئے گئے اور مقدمہ حال و قال کے نام لکھ دیا گیا۔ اور کئی سالوں بعد طبع ہوئی۔ اب دوبارہ سہ بارہ طبع ہو چکی ہے۔

آپ نے قصور میں وصال فرمایا۔ مخلصین کی ایک جماعت چھوڑ گئے۔ ان میں کئی اچھے صالح آدمی بھی دیکھنے میں آئے۔ لیکن خود آخری نشان آپ ہی تھے۔ بعد میں کوئی ان کا مسند نشین نہیں۔

صوفی صاحب کا قبری نشان اسی گورستان میں حضرت عبدالرسول صاحب کے مزار شریف اور مسجد کے مشرقی جانب کچھ فاصلہ پر ہے۔ کئی بار حاضری ہوئی مزارات کا ماحول نہایت پُرسکون ہے۔ بیٹھنے کو جی چاہتا ہے۔

حضرت قبلہ میاں صاحبؒ کی محبّت: حضرت نے کئی بار وصال سے پہلے اثنائے گفتگو میں صوفی صاحب اور قاری اللہ بخش مرحوم سے الگ الگ فرمایا، کیا اچھا ہوتا، آپ اور قاری صاحب ہی مجھے کسی جگہ اوپر نیچے کر دیتے۔ اور کسی گڑھے میں پھینک دیتے۔ ایک تو ان الفاظ سے حضرت میاں صاحبؒ کی فنا و بقا کا پتہ چلتا ہے۔ دوسرے ان ہر دو بھائیوں کے اخلاص و محبّت کا درجہ بڑا ہے۔ تیسرے حضرتِ اعلیٰ بریلوی رحمتہ اللہ علیہ کے ساتھ انس و محبّت کے نشانات ملتے ہیں

حضرتؒ قبلہ سیّد محمّد شاہ صاحبؒ سجادہ نشین قصور شریف

صاحبزادہ حضرت سیّد محمد شاہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ حضرت عبدالرسول صاحب کے نواسے اور شاہ صاحب غلام حسن شاہ ساہی وال والوں کے صاحبزادے تھے۔ آپ دو بھائی حقیقی تھے۔ دوسرے بھائی صاحب کا نام سید احمد شاہ صاحب تھا۔ وہ وکالت پڑھ کر لاہور ہوئے۔ دوسرے ان کی شادی بھی حضرت شاہ ابوالخیر شاہ صاحب

رحمۃ اللہ علیہ کی دختر نیک اختر سے ہوئی۔

سید محمدؒ شاہ صاحب کی شادی علی پور سیداں متصل بھیرہ ہوئی تھی۔ شاہ صاحب کے اجداد تو ساہیوال ضلع شاہپور رہا کرتے تھے لیکن حسبی نسبت سے آپ کے والد صاحب کا قیام قصور شریف ہو گیا۔ جب کہ حضرت عبدالرسول صاحب وصال پا گئے۔

شاہ صاحب بڑے ذکی الطبع تھے۔ اور ذوق سلیم کے مالک تھے۔ آپ جب اورینٹل کالج کے داخلہ کے بعد مولوی فاضل کے امتحان سے فارغ ہوئے، تو آبائی سلسلہ کا خیال آیا فطرت صالح تھی۔ بہت بڑے عالم تھے۔ خیال بھی یہی تھا کہ اپنے سلسلہ کے کسی بزرگ سے بیعت ہو جائے پھر ہمارے حضرت اعلیٰ بیربلوی رحمۃ اللہ علیہ قصور شریف حضرت اعلیٰ مولانا و مرشدنا قبلہ غلام محی الدین صاحبؒ کی خانقاہ معلےٰ پر اکثر بارہ دن قیام بھی فرمایا کرتے۔ صاحبزادہ صاحب بھی آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہوں گے۔ بہرصورت صاحبزادہ صاحب کی نظر مبارک حضرت اعلیٰؒ کے سوائے کسی پر نہ جمی۔ حضرت اعلیٰ للہی رحمۃ اللہ علیہ کا وصال بھی ہو چکا۔

جہاں ہمارے حضرت اعلیٰؒ علم پر کامل دسترس رکھتے تھے، وہاں ہمارے حضرت ذکی الطبع اور بلند حافظہ کے مالک بھی تھے۔ شاہ صاحب قصور شریف سے آئے اور بیربل شریف آکر مشرف بیعت ہوئے۔ حضرت قبلہ بہت مہربان تھے جب شاہ صاحب تشریف لاتے تھے، تو سروقد کھڑے ہو جاتے تھے۔ اور شاہ صاحب تھے کہ علم کے ساتھ بہت سادگی کے مالک تھے اور میرے والد رحمۃ اللہ علیہ کے ہم عمر بھی تھے۔ اسی وجہ سے شاہ صاحب کو میرے والد صاحب کے ساتھ خاص اُنس تھا اور اکثر میرے والد صاحب کے ساتھ صحبت رہتی تھی۔ اس وقت میرے والد صاحب صدر مدرس ہونے کی حیثیت سے ایک کامل عبور کتب نصاب نظامیہ پر رکھتے تھے۔ اور بحر ذخار کی طرح بولتے نظر آتے تھے۔ ہر کتاب پر کامل نظر تھی۔ اور ہر مسئلہ کی حقیقت سامنے تھی۔ مطالعہ سے نکل گئے تھے۔ ایسے معلوم ہوتا تھا کہ سب کچھ یاد اور حاضر ہے۔

شاہ صاحب کا قیام بھی، جب کبھی آجاتے، تو بلا تکلف کئی دن قیام رہا کرتا تھا۔ اسی حجرہ میں ٹھہرتے تھے، جو میرے والد صاحب کے تصرف میں تھا۔ اور مسجد کے جنوب مشرقی جانب تھا۔

"انوارِ مرتضویہ"

حضرت مولانا و مرشدنا خواجہ غلام مرتضیٰ رحمۃ اللہ علیہ کے حالاتِ زندگی پر مشتمل پہلی اور مستند سوانح حیات "انوارِ مرتضویہ" جسے مولوی عبد الرسول صاحب مرحوم ساکن بکھر بار نے نہایت محنت اور شوق سے لکھا اور طبع کروایا تھا۔ عرصہ دراز سے یہ کتاب ناپید ہو چکی تھی۔ چند سال پہلے دار العلوم عطائیہ نلی کے مہتمم جناب قاضی محمد رضا صاحب نے اسے دوبارہ طبع کرایا تھا۔

آستانۂ عالیہ بیربل شریف کے ارادت مندوں نے اس کتاب کو پسند کیا اور کافی تعداد میں خریدا۔ اِس نایاب کتاب کی کچھ کاپیاں دار العلوم نلی ضلع خوشاب میں موجود ہیں۔ جس کسی کو ضرورت ہو حسبِ ذیل پتہ پر خط لکھ کر حاصل کر سکتا ہے۔

منجانب

قاضی احمد رضا نائب مہتمم

دار العلوم عطائیہ نلی ضلع خوشاب